کلیاتِ منیر
منیر نیازی

کلیاتِ منیر

ماورا پبلشرز۔ ۳ بہاولپور روڈ۔ لاہور

غلام رسول ناصر
جون ۱۹۸۶ء

تیز ہوا اور تنہا پھول

منیر نیازی

انتساب

خُدا کے نام

لَا اِلٰهَ اِلّآ اَنتَ سُبحَانَکَ اِنّیِ کُنتُ مِنَ الظّٰالِمِیْنَ

ترتیب

گیت

برسات

آہ ! یہ بارانی رات
مینہ ، ہَوا ، طوفان ، رقصِ صاعقات
شش جہت پر تیرگی اُمڈی ہُوئی
ایک سنّاٹے میں گم ہے بزم گاہِ حادثات
آسماں پر بادلوں کے قافلے بڑھتے ہُوئے
اور مری کھڑکی کے نیچے کانپتے پیڑوں کے ہات
چارسُو آوارہ ہیں
بُھولے ، بِسرے واقعات
جھکّڑوں کے شور میں
جانے کِتنی دُور سے
سُن رہا ہوں تیری بات

یہ صدا

یہ صدائے بازگشت

بیکراں وسعت کی آوارہ پری

سُست رَو جھیلوں کے پار

نم زدہ پیڑوں کے پھیلے بازوؤں کے آس پاس

یک غم دیدہ پرند

گیت گاتا ہے مری ویران شاموں کے لیے

شبِ ویراں

یوکلپٹس کے پیڑ کے اُوپر
ٹھٹھرے تاروں کے پھیلے جنگل میں
چاند تنہا اُداس پھرتا ہے

یوکلپٹس کی سرد شاخوں سے
ٹھنڈے جھونکے لپٹ کے روتے ہیں

یوکلپٹس کے پیڑ کے نیچے
خشک پتّے ہوا میں اُڑتے ہیں

نیا موہ

تم بھی کہو —— تم سچّی ہو!
تم بھی اِن کاجل سے سجی آنکھوں میں آنسو لے آؤ
تم بھی ان کومل ہونٹوں سے چاہت کے سنگیت سناؤ

ایسی رات میں، جب آکاش پہ گہرا، گھور اندھیرا ہے
دُور دُور کی آوازوں نے سُکھ کا جال بکھیرا ہے
تم بھی چھیڑ کے پریت کی باتیں، بھُولے بِسرے غم کو جگاؤ

تم سے کہوں میں، مجھ سے کہو تم
ساتھ نبھانے والی باتیں
دل کو لبھانے والی باتیں

تم سے کون کہے یہ چاہت رات کی رات ہے، مٹ جائیگی
رات کی مہکی سیج کی خوشبو، دن آیا تو مٹ جائیگی

یوں ہی ہر من موہنی صُورت
دل میں جو بس جاتی ہے
رو رو کر سمجھاتی ہے
"مَیں سچّی ہُوں ـــــ"

غزل

ہیں آباد لاکھوں جہاں میرے دل میں
کبھی آؤ دامن کشاں میرے دل میں

اُترتی ہے دھیرے سے راتوں کی چُپ میں
ترے رُوپ کی کہکشاں میرے دل میں

اُبھرتی ہیں راہوں سے کرنوں کی لہریں
سسکتی ہیں پرچھائیاں میرے دل میں

وہی نُور کی بارشیں کاخ و کُو پر
وہی جھٹپٹے کا سماں میرے دل میں

زمانے کے لب پر زمانے کی باتیں
مری دُکھ بھری داستاں میرے دل میں

کوئی کیا رہے گا جہانِ فنا میں
رہو تم رہو جاوداں میرے دل میں

رشتۂ خیال

کبھی کسی بام کے کنارے
اُگے ہُوئے پیڑ کے سہارے
مجھے ملی ہیں وہ مست آنکھیں
جو دل کے پاتال میں اُتر کر
گئے دنوں کی کپھائیں چھانکیں

کبھی کسی اجنبی نگر میں
کسی اکیلے، اُداس گھر میں
پری رُخوں کی حسین سبھا میں
کسی بہارِ گریز پا میں
کبھی سرِ رہ، کبھی سرِ کُو
کبھی پسِ در، کبھی لبِ جُو
مجھے ملی ہیں وہی نگاہیں
جو ایک لمحے کی دوستی میں
ہزار باتوں کو کہنا چاہیں

روشنی

تھکی تھکی گلوں کی بُو
بھٹک رہی ہے جُو بہ جُو

چھلک رہے ہیں چار سُو
لبوں کے رس بھرے سبُو

ہوا چلی تو چل پڑیں
کہانیاں سی کُو بہ کُو

لبِ مہ و نجوم پر
رُکی رُکی سی گفتگو

یہ اک خلائے دم بخود
یہ اک جہانِ آرزو

گئے دنوں کی روشنی
کہاں ہے تُو، کہاں ہے تُو

آمدِ شب

دیے ابھی نہیں جلے
درخت بڑھتی تیرگی میں چھپ چلے
پرند قافلوں میں ڈھل کے اُڑ چلے
ہوا ہزار مرگِ آرزو کا ایک غم لیے
چلی پہاڑیوں کی سمت رُخ کیے
کُھلے سمندروں پہ کشتیوں کے بادباں کھلے
سوادِ شہر کے کھنڈر
گئے دنوں کی خوشبوؤں سے بھر گئے
اکیلی خواب گاہ میں
کسی حسیں نگاہ میں
الم میں بیٹھی چاہتیں دردِ شب سے جاگ اُٹھیں
ہے دل کو بے کلی، سیاہ رات آئے گی
جلو میں دُکھ کی لاگ کو لیے ہوئے
نگر نگر پہ چھائے گی

حدیثِ دل

کبھی تو بن جائے گا سہارا
کسی افق کا کوئی ستارا
اسی تمنّا میں مضطرب ہے
عجیب شے ہے یہ دل ہمارا

گزرتے جھونکوں کے کارواں نے
یونہی کوئی راگنی سُنا دی
تو اس کے خوابوں میں جاگ اُٹھتی
ہے خُوب صُورت سی شاہزادی

بہار کی رُت میں جب ہوائیں
سُلگتی خوشبُو اڑا کے لائیں
تو اس کے ہر سمت شور کرتی
ہیں بیتتے لمحوں کی اپسرائیں

جہاں کہیں ایک پل کسی نے
اسے کبھی پیار سے بُلایا
یہ ایسا مورکھ ہے جان لے گا
بس اب خوشی کا زمانہ آیا

منڈیریں چُپ ہیں ستارے جھلمل
ہوا میں گم ہے وہ ماہِ کامل
سُنا ہوا کو، فسانے غم کے
ارے مرے دل، ارے مرے دل

خزاں

ہوا کی آواز
خشک پتّوں کی سرسراہٹ سے بھر گئی ہے
روش روش پر فتادہ پھولوں نے
لاکھوں نوحے جگا دیے ہیں
سلیٹی شاہیں، بلند پیڑوں پہ غل مچاتے
سیاہ کوّوں کے قافلوں سے اٹی ہوئی ہیں
ہر ایک جانب خزاں کے قاصد لپک رہے ہیں
ہر ایک جانب خزاں کی آواز گونجتی ہے
ہر ایک بستی کشاکشِ مرگ و زندگی سے نڈھال ہو کر
مسافروں کو پکارتی ہے کہ — "آؤ
مجھ کو، خزاں کے بے مہر تلخ احساس سے بچاؤ"

ایک لڑکی

ذرا اس خود اپنے ہی
جذبوں سے مجبُور لڑکی کو دیکھو
جو اک شاخِ گل کی طرح
اَن گنت چاہتوں کے جھکولوں کی زد میں
اُڑی جا رہی ہے
یہ لڑکی
جو اپنے ہی پھُول ایسے کپڑوں سے شرماتی
آنچل سمیٹے، نگاہیں جھکاتے چلی جا رہی ہے
جب اپنے حسیں گھر کی دہلیز پہ جا رُکے گی
تو مُکھ موڑ کر مسکرائے گی جیسے
ابھی اس نے اک گھات میں بیٹھے
دل کو پسند آنے والے
شکاری کو دھوکا دیا ہے

غم

یہ سب چاند، تارے
بہاریں، خزائیں، بدلتے ہوئے موسموں کے ترانے
ترا حُسن، میری نم آلود آنکھیں
تصوّر کے ایواں، نگاہوں کی کلیاں، لبوں کے فسانے
یہ سب میرے سانسوں کی جادوگری ہے
مگر پھر بھی مجھ کو یہ غم ہے کہ جب میں مروں گا
یہ سب چاند، تارے
بہاریں، خزائیں
بدلتے ہوئے موسموں کے ترانے
ترا حُسن، دنیا کے رنگیں فسانے
یہ سب مل کے زندہ رہیں گے
فقط اک مری اشک آلود آنکھیں نہ ہوں گی — !

من مُورکھ

دل کہتا ہے، اِس دنیا میں
کوئی تو ایسی نار ملے
جس کے روپ کو جو بھی دیکھے
اس کے من کا کنول کھلے
سب جگ چھوڑ کے وُہ، بس ہم سے
پریم کی بات نبھائے
جب بھی ہم پردیس سدھاریں
رو رو نین گنوائے
وہ ہم کو اس امر پریم کے
لاکھوں گیت سُنائے

جس کی کھوج میں دنیا والے
گھاٹ گھاٹ کا بِس پی آئے
انجانے دیسوں میں پھرتے
دھیان میں ایسی گوری آئے
جو سکھیوں سے دُور ، اکیلی
اپنی یاد میں جلتی جائے

پت جھڑ

وہ دن بھی آنے والا ہے
جب تیری ان کالی آنکھوں میں ہر جذبہ مٹ جائے گا

تیرے بال، جنھیں دیکھیں — تو
ساون کی گھنگھور گھٹائیں، آنکھوں میں لہراتی آئیں
ہونٹ رسیلے
دھیان میں لاکھوں پھولوں کی مہکار جگائیں

وہ دن دُور نہیں جب ان پر
پت جھڑ کی رُت چھا جائے گی
اور اُس پت جھڑ کے موسم کی
کسی اکیلی شام کی چُپ میں؟
گئے دنوں کی یاد آئے گی
جیسے کوئی کسی جنگل میں گیت سہانے گاتا ہے
——— تجھ کو پاس بلاتا ہے

سراپا

اس کی آنکھیں کالے بھنوروں کی حزیں گنجار ہیں

ہونٹ اس کے عطر میں بھیگے ہوئے یاقوت کی مہکار ہیں

اس کی گردن جیسے مینائے شراب

اس کے نازک ہاتھ جیسے باغ میں رنگیں گلاب

بال اس کے کالی مخمل کا حسیں انبار ہیں

دانت جیسے موتیئے کا خوب صورت ہار ہیں

یہ بھنویں ہیں یا گھٹائیں جھوم کر آئی ہوئیں؟

اور پلکیں کوہِ غم کو چوم کر آئی ہوئیں؟

پیٹ — مرمر کی تراشیدہ چٹان

ناف — شکر کے نشے میں سویا مکان

ساق — پورے چاند کی پہلی سُریلی تان ہے

سینہ — شیریں شہد میں ڈوبا ہُوا پیکان ہے

اس کی ریشم سی کمر کھاتی ہے بل وقتِ خرام
اس کے کوٹھے دیکھنے والی نگاہوں کے لیے ہیں تنگ دام
اس کی رنگت شرم سے گلنار ہے
اس کا ہر جذبہ ہوائے عشق سے سرشار ہے

غزل

اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

لائی ہے اب اڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رُت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو

دل کو ہجومِ نکہتِ مہ سے لہو کیے
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو

پھرتے ہیں مثلِ موجِ ہوا شہر شہر میں
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

برہا کا گیت

بچھڑ کے جانے والے لوگو
جب بھی رات کو بادل برسے
ہم کو دھیان میں لا کر اتنا روؤ کہ آنکھوں کا کاجل
بہہ کر سندر گال بھگو دے

بچھڑ کے جانے والے لوگو
جب بھی رات کو بجلی چمکے
چاہت کے سنگیت سنا کر ہمیں بلاؤ
ہم بھی ہوا کے جھونکوں میں
ہر اُجڑے نگر میں جاتے ہیں
اور گیت پرانے گاتے ہیں

ملن کی رات

اے دوشیزہ! مت گھبرا
اب سُورج ڈوبنے والا ہے
سُورج ڈوب کے ایک اندھیری کالی رات کو لائے گا
لاکھوں اَن ہونی باتوں کا میلہ دھیان میں لائے گا
پھر بادل گھِر کر آئیں گے
گرج گرج کر، چمک چمک کر تیرا جی دہلائیں گے
برکھا کے اُس سنّاٹے میں، مکٹ سجائے
اک متوالا آئے گا
ساتھ تجھے لے جائے گا

پریم کہانی

دُور کہیں اک مدھوبن ہے
اُس بن کا ہر پیڑ ہرا ہے
اُس بن میں اک موہ بھرا ہے

اُس میں کوئلیں رہتی ہیں
دن کو سُکھ کی تان اڑا کر
رات کو وُہ دُکھ سہتی ہیں

اُس بن میں اک بھولی رادھا
شیام سے ملنے آتی تھی
جب اس کو نہیں پاتی تھی
تو رو رو نین گنواتی تھی

پریم کی اِس متوالی کتھا کو
کئی زمانے بیت گئے ہیں
اُس جُگ کی ہر تان مٹی ہے
اس جُگ کے سب گیت گئے ہیں

وہ مدھوبن اب تک ویسا ہے
اُس بن کا ہر پیڑ ہرا ہے
اُس بن میں ایک موہ بھرا ہے

رات کی اذیّت

رات بے حد چُپ ہے اور اس کا اندھیرا شرمگیں
شام پڑتے ہی دمکتے تھے جو رنگوں کے نگیں
دُور تک بھی اب کہیں ان کا نشاں ملتا نہیں

اب تو بڑھتا آئے گا گھنگھور بادل چاہ کا
اس میں بہتی آئے گی اک مدھ بھری میٹھی صدا
دل کے سُونے شہر میں گونجے گا نغمہ چاہ کا

رات کے پردے میں چھُپ کر خوں رُلاتی چاہتو
اس قدر کیوں دُور ہو مجھ سے ذرا یہ تو کہو
میرے پاس آ کر کبھی میری کہانی بھی سُنو

سسکیاں لیتی ہوائیں کہہ رہی ہیں چُپ رہو

میرا سین

یوں تو اس من موہنے دیس کی ہر بالا مدھو بالا ہے
اس کے ہر اک انگ میں میٹھی کامناؤں کا بھالا ہے
اس کے مکھ کا جو بھی بول ہے جادو کرنے والا ہے

پر اک کنیا ایسی ہے جو روپ میں سب سے نیاری ہے
اس کی ہر چھب چاہنے والے دل میں دکھ کی کیاری ہے

وہ چھپ چھپ کر دُور دُور سے آنکھوں میں مسکاتی ہے
ہونٹوں کی پیاس بڑھاتی ہے اور دل میں اندھیرا لاتی ہے

غزل

اُن سے نین ملا کے دیکھو
یہ دھوکا بھی کھا کے دیکھو

دُوری میں کیا بھید چھپا ہے
اس کا کھوج لگا کے دیکھو

کسی اکیلی شام کی چپ میں
گیت پرانے گا کے دیکھو

آج کی رات بہت کالی ہے
سوچ کے دیپ جلا کے دیکھو

دل کا گھر سنسان پڑا ہے
دکھ کی دھوم مچا کے دیکھو

جاگ جاگ کر عمر کٹی ہے
نیند کے دوارے جا کے دیکھو

لیلیٰ

رات کی اُونچی فصیلوں پر دمکتے، لال ہونٹوں والی کالی حبشنیں خنجر بکف
اور فصیلوں سے گھرے جادو بھرے شہروں کی دھندلی روشنی میں ہر طر
دائروں میں گیت گاتی دلہنوں کے مرمریں ہاتھوں میں بجتے زرد دف

شش جہت کی تیرگی میں دم بدم بڑھنے لگی ہے مورپنکھوں کی صف
چھا رہا ہے کھڑکیوں پہ سرنگوں، پھولوں بھری بیلوں کا رنگیں سلسل
لگ رہا ہے سُرخ ریشم سے سجے کمروں میں شرمیلی نگاہوں کا رسیلا جمگھٹ

کس حسیں، خاموش گلشن میں کھلا ہے میری چاہت کا دمکتی پنکھڑیوں والا گلاب
کون سے جادو بھرے کوچے میں بہتی ہے اُن آنکھوں کی خمار آگیں شراب
کب فصیلِ شب کے اِک پوشیدہ دروازے سے جھانکے گا وہ چمکیلا سراب
بول اے بادِ شبانہ کے نرالے نقش دکھلاتے ہُوئے گونگے رباب

طلسمات

پرے سے دیکھو تو صرف خوشبو قریب جاؤ تو اِک نگر ہے

طلسمی رنگوں سے بھیگتے گھر نسائی سانسوں سے بند گلیاں
خموش محلوں میں خُوب صُورت طلائی شکلوں کی رنگ رلیاں
کسی دریچے کی چق کے پیچھے دہکتے ہونٹوں کی سُرخ کلیاں
پرے سے تکتی ہر اک نظر اس نگر کی راہوں سے بے خبر ہے

حنائی انگشت کا اشارہ لجائی آنکھوں کی مسکراہٹ
کبھی یونہی راہ چلتے اک ریشمی دوپٹے کی سرسراہٹ
سیاہ راتوں کو ہولے ہولے قریب آتی ہوئی سی آہٹ
یہ ساری راہیں ہیں اُس نگر کی جو دائمی آنسوؤں کا گھر ہے

آتما کا روگ

شراپ دے کے جا چکے ہیں سخت دل مہاتما
سمے کی قید گاہ میں بھٹک رہی ہے آتما

کہیں سلونے شیام ہیں نہ گوپیوں کا پھاگ ہے
نہ پائلوں کا شور ہے نہ بانسری کا راگ ہے
بس اک اکیلی رادھیکا ہے اور دُکھ کی آگ ہے

ڈراونی صداؤں سے بھری ہیں رات کی گپھائیں
اُداس ہو کے سُن رہی ہیں دیوتاؤں کی کتھائیں
بہت پُرانے مندروں میں رہنے والی اپسرائیں
ہوئیں ہوائیں تیز تر بڑھی بنوں کی سائیں سائیں

دُوری

دُور ہی دُور رہی بس مجھ سے
پاس وہ میرے آ نہ سکی تھی
لیکن اس کو چاہ تھی میری
وہ یہ بھید چھپا نہ سکی تھی

اب وہ کہاں ہے اور کیسی ہے
یہ تو کوئی بتا نہ سکے گا
پر کوئی اس کی نظروں کو
میرے دل سے مٹا نہ سکے گا

اب وہ خواب میں دلہن بن کر
میرے پاس چلی آتی ہے
میں اس کو تکتا رہتا ہوں
لیکن وہ روتی جاتی ہے

موت

ہر طرف خاموش گلیاں زرد رُو گونگے مکیں
اُجڑے اُجڑے بام و در اور سُونے سُونے شہ نشیں
ممٹیوں پر ایک گہری خامشی سایہ فگن
رینگ کر چلتی ہوا کی بھی صدا آتی نہیں

اس سکوتِ غم فزا میں اک طلسمی نازنیں
سُرخ گہرے سُرخ لب اور چاند سی پیلی جبیں
آنکھ کے مبہم اشارے سے بلاتی ہے مجھے
ایک پُر اسرار عشرت کا خزانہ ہے وہ چشمِ دل نشیں

حقیقت

نہ تو حقیقت ہے اور نہ میں ہوں
نہ تیری مری وفا کے قصّے
نہ برکھا رُت کی سیاہ راتوں میں
راستہ بھُول کر بھٹکتی ہوئی سجل ناریوں کے جھرمٹ
نہ اُجڑے نگروں میں خاک اُڑاتے
فسردہ دل پریمیوں کے نوحے
اگر حقیقت ہے کچھ تو یہ اک ہوا کا جھونکا
جو ابتدا سے سفر میں ہے
اور جو انتہا تک سفر کرے گا

غزل

اس مینہ سے بھری شب میں بجلی جو کڑک جائے
اس شوخ کا ننھا سا دل ڈر سے دھڑک جائے

اس سمت چلو تم بھی اے بھٹکے ہوئے لوگو
جس سمت یہ ویراں سی چپ چاپ سڑک جائے

یہ ڈوبتا سورج اور اس کی لبِ بام آمد
تا حدِ نظر اس کے آنچل کی بھڑک جائے

گلشن کی خموشی تو اب جی کو ڈراتی ہے
کوئی بھی ہو اجس سے پتہ ہی کھڑک جائے!

مدت سے جو روٹھے ہیں اور مجھ سے نہیں ملتے
گر شعر مرے سن لیں جی اُن کا پھڑک جائے

کون

کوئی شام کے وقت
نظروں کی حد پہ کھڑے سبز جنگل میں جائے
تو اس کو ہوا میں
غموں کی حکایت سے لبریز اک تان سننے میں آئے
کسی رات کی نیلی چُپ میں
اگر میں کبھی اُن گلوں سے لدی چوٹیوں پہ کھڑا ہو کے
تاروں کو چھُونے کی کوشش کروں تو
کوئی رو کے کہتا ہے ''یہ مت کرو''
کہو کون ہے یہ، جو چھُپ کر
سرِ رہگزر اُڑنے والے حسیں آنچلوں کے مدھر راگ میں
ایک جاں لیوا دُکھ کی جلن گھولتا ہے

کہو کون ہے؟

جس نے ہر سبز جنگل میں چلتی ہواؤں
گلوں سے لدی چوٹیوں پر چمکتے ستاروں
کو دکھ کی امر تان سے بھر دیا ہے
کہو کون ہے؟

اشارے

شہر کے مکانوں کے
سرد سائبانوں کے
دلربا، تھکے سائے
خواہشوں سے گھبرائے
رہرووں سے کہتے ہیں
رات کتنی ویراں ہے
موت بال افشاں ہے
اس گھنے اندھیرے میں
خواہشوں کے ڈیرے میں
دل کے چور بستے ہیں
ان کے پاس جانے کے
لاکھ چور رستے ہیں

کال

رم جھم رم جھم بادل برسے بجلی شور مچائے
اُجڑے ہوئے نگروں میں بسنے والے دھندلے سائے
کالی رات کا روپ دھار کر مجھے ڈرانے آئے

دل دہلانے والی آوازوں کا جادو جاگا
پاگل جھونکوں کے ڈر سے ہر گھر کا اُجالا بھاگا
دُکھ کے بوجھ سے ٹوٹ رہا ہے موہ کا کچا دھاگا

ایک ہی جلتی سوچ کی اگنی ہردے کو کلپائے
کیا ہو جو اس کالی رات کی بھور کبھی نہ آئے
گلی گلی کے دیپ بجھاتی برکھا بڑھتی آئے

غزل

یہ لڑکی جو اس وقت سرِ بام کھڑی ہے
اُڑتا ہوا بادل ہے کہ پھُولوں کی لڑی ہے

شرماتے ہُوئے بندِ قبا کھولے ہیں اس نے
یہ شب کے اندھیروں کے مہکنے کی گھڑی ہے

اک پیرہنِ سُرخ کا جلوہ ہے نظر میں
اک شکل نگینے کی طرح دل میں جڑی ہے

کھِلتا تھا کبھی جس میں تمنّا کا شگوفہ
کھڑکی وہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

طاؤس کی آواز سے روشن ہے شبِ تار
صد نغمۂ ناہید یہ ساون کی جھڑی ہے

زنداں

شام ہوتے ہی شرابِ عشق پی کر جھومتی شہزادیاں
دُوریوں پر مُسکراتی نازنینوں کی حسیں آبادیاں
خواہشوں کی آگ میں دن رات جلتے گلبدن
اطلس و زربفت پہنے محلوں کی تنہائی میں روتے سیم تن

شرم کی خوشبو سے جھکتی جا رہی معصوم چنچل لڑکیاں
اپنی محبوباؤں کے گلریز پہلو میں بہکتے نوجواں
اُجڑے شہروں کے مکانوں کے اکیلے نوحہ خواں
اپنے اپنے دائرے میں ہر کوئی بے چین ہے
گردبادِ یاس و غم میں گم ہے یہ کون و مکاں

خلش

وہ خوب صورت لڑکیاں
دشتِ وفا کی ہرنیاں
شہرِ شبِ مہتاب کی
بے چین جادوگرنیاں
جو بادلوں میں کھو گئیں
نظروں سے اوجھل ہو گئیں
اب سرد، کالی رات کو
آنکھوں میں گہرا غم لیے
اشکوں کی بہتی نہر میں
گلنار چہرے نم کیے
ہنسی کی سرحد سے پرے
خوابوں کی سنگیں اوٹ سے
کہتی ہیں مجھ کو "بے وفا!
ہم سے بچھڑ کر کیا تجھے
سکھ کا خزانہ مل گیا؟"

آخری عمر کی باتیں

وہ میری آنکھوں پر جھک کر کہتی ہے "میں ہوں"
اس کا سانس مرے ہونٹوں کو چھو کر کہتا ہے "میں ہوں"
سُونی دیواروں کی خموشی سرگوشی میں کہتی ہے "میں ہوں"
"ہم گھائل ہیں" سب کہتے ہیں
میں بھی کہتا ہوں — "میں ہوں"

شبخوں

جب بَن سیاہ رات کے تاروں سے بھر گئے
گُنجِ چمن میں چمکے شگوفے نئے نئے

مجھ کو ہوا نے بات سجھائی عجیب سی
بادل میں ایک شکل دکھائی عجیب سی

چاند آسماں کی سیج پہ سویا ہُوا مِلا
رنگِ گُلِ انار میں لتھڑا ہُوا مِلا

اے عاشقانِ حسنِ ازل! غور سے سنو
یہ داستانِ جنگ و جدل غور سے سنو

میں برگِ بے نوا تو نہیں ہوں کہ چُپ رہوں
دل کے کسی بھی شعلے کو عُریاں نہ کر سکوں

میں تیغ ہاتھ میں لیے سُوئے فلک گیا
جذبوں کے رس سے مہکے ہوئے چاند تک گیا

کافی تھا ایک وار مری تیغِ تیز کا
مہتاب کے بدن سے لہو پھُوٹ کر بہا

پاگل پن

اِک پردہ کالی مخمل کا آنکھوں پہ چھانے لگتا ہے
اِک بھنور ہزاروں شکلوں کا دل کو دہلانے لگتا ہے
اک تیز حنائی خوشبو سے ہر سانس چمکنے لگتا ہے
اک پھول طلسمی رنگوں کا گلیوں میں دمکنے لگتا ہے
سانپوں سے بھرے اک جنگل کی آواز سنائی دیتی ہے
ہر اینٹ مکانوں کے چھجوں کی خون دکھائی دیتی ہے

بے بسی

پھلجھڑی سسکی کی گہری رات میں چھوٹی نہیں
جوئے خوں کوہِ سیہ کی آنکھ سے پھوٹی نہیں
خیمۂ غم کی طنابِ ریشمیں ٹوٹی نہیں
تیرگی کے راہ زن نے دختِ زر لوٹی نہیں

کشتئ دل بحرِ غم کی موج میں کھیتے رہو
اپنے ہی خوں کے چراغاں کے مزے لیتے رہو
عمر بھر شب کے اندھیرے کو صدا دیتے رہو

جادُو کا کھیل

رنگ برنگے شیشوں والی کھڑکی بند پڑی ہے اب
وہ لڑکی جو اس میں کھڑی لوگوں کو خواب دکھاتی تھی
کالی کالی راتوں میں ہونٹوں کی شمع جلاتی تھی
تیز نگاہوں کی بجلی سے سب کے ہوش اُڑاتی تھی
دستِ حنائی کے شعلے سے جی میں آگ لگاتی تھی
اب وہ دلوں سے کھیلنے والی لڑکی تو ہے بیاہی گئی
سنتے ہیں وہ لڑکی جاتے وقت بہت ہی روئی تھی
یوں لگتا تھا اُس کی کوئی قیمتی سی شے کھوئی تھی

غزل

وہ جو میرے پاس سے ہو کر کسی کے گھر گیا
ریشمی ملبوس کی خوشبو سے جادو کر گیا

اک جھلک دیکھی تھی اُس روئے دلآرا کی کبھی
پھر نہ آنکھوں سے وہ ایسا دلربا منظر گیا

شہر کی گلیوں میں گہری تیرگی گریاں رہی
رات بادل اس طرح آئے کہ میں تو ڈر گیا

تھی وطن میں منتظر جس کی کوئی چشمِ حسیں
وہ مسافر جانے کس صحرا میں جل کر مر گیا

صبحِ کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

ایک رسم

شہر کے گھر سنسان پڑے ہیں
سارے لوگ گھروں سے باہر
چاند کی پوجا کرنے گئے ہیں

وہ ویراں باغوں میں جا کر
چاند نکلتا دیکھتے ہیں
جب مشرق پر روشنی کا
اک تیز نشان دمکتا ہے
وہ سرگوشی کے لہجے میں
کچھ منتر پڑھنے لگتے ہیں

رات گئے تک اسی طرح وہ
چاند کو جلتا دیکھتے ہیں
دُوری کے ریگستانوں میں
لَو اگلتا دیکھتے ہیں

بے وفائی

رنگ کی سِل کو اُٹھا کر
دُور تک جانا بہت دشوار ہے
ہر در و دیوار سے مِل کر جُدا ہوتی ہوا سے
دیر تک نظریں ملانا بھی بہت دشوار ہے
آنکھ کے آنسو کو
ہیرے کی طرح دل میں چھپانا بھی بہت دشوار ہے
دوریوں پہ بیٹھ کر ہنستی ہیں سُکھ کی دُلہنیں
شرم کے فانوس سے جگمگ ہیں شہروں کے مکاں
جذبۂ شب کی کلیدِ احمریں
کھولتی ہے عشرتوں کے سیل کا قفلِ گراں
رینگتے چلتے ہیں دشتِ شوق میں
حسن کے جادو میں ڈوبے محملوں کے کارواں

لاکھ کوئی دوریوں پر بیٹھ کر روتا رہے
رنگ کی سِل کو اُٹھا کر
دُور تک جانا بہت دشوار تھا
ہر درو دیوار سے مل کر جُدا ہوتی ہوا سے
دیر تک نظریں ملانا بھی بہت دشوار تھا

دُور کے نگر

دُور کے نگروں میں جانے کا دل کو شوق بڑا ہے

اُن میں سکھ سے بھرے آنگن ہیں، ٹھنڈی تیز ہَوا ہے
رنگ برنگی کامنیوں کے رُوپ کا دیپ جلا ہے
گلیوں میں کاجل سے سجی آنکھوں کا میلہ لگا ہے

ان نگروں کی کھوج میں پھرتے جیون انت ہُوا ہے

جب رات کا پہلا گجر بجے
تب اس گوری کی سیج سجے
آشا کا مہکتا پھول کھلے
بچھڑا ہوا پریمی آن ملے
میٹھی باتوں کی دھوم مچے
جلتے سانسوں کی راس رچے
پھر کام کا زہری بان چلے
گوری رو رو کر ہاتھ ملے

کلپنا

رات ہے کتنی گہری کالی
دُکھ کی بات سُجھانے والی
دُور دُور کی آوازوں کو
اُجڑے گھروں میں لانے والی

سر پہ ہے گھنگور بدریا
دل میں لگن پریتم کے ملن کی
شور مچاتی بڑھتی آئے
تیز ہوا سونے مدھوبن کی

چڑھتا ساگر رستہ روکے
بیرن بجلی جی کو ڈرائے
دُور بہت ہے پی کی نگریا
ہم سے تو اب چلا نہ جائے

غزل

بیگانگی کا ابرِ گراں بار کھُل گیا
شب مَیں نے اس کو چھیڑا تو وہ یار کھُل گیا

گلیوں میں شام ہوتے ہی نکلے حسین لوگ
ہر رہگزر پہ طبلہء عطّار کھُل گیا

ہم نے چھپایا لاکھ مگر چھُپ نہیں سکا
انجامِ کارِ رازِ دلِ زار کھُل گیا

تھا عشرتِ شبانہ کی سرمستیوں میں بند
بادِ سحر سے دیدۂ گلبار کھل گیا

آیا وہ بام پر تو کچھ ایسا لگا منیرؔ
جیسے فلک پہ رنگ کا بازار کھُل گیا

مَیں

میں بھی دل کے بہلانے کو کیا کیا سوانگ رچاتا ہوں
سایوں کے جھُرمٹ میں بیٹھا سُکھ کی سیج سجاتا ہوں
بجھتے جلتے دیپک سے سپنوں کے چاند بناتا ہوں
آپ ہی کالی آنکھیں بن کر اپنے سامنے آتا ہوں
آپ ہی دکھ کا بھیس بدل کر ان کو ڈھونڈنے جاتا ہوں

مَیں اور بادل

شام کا بادل نئے نئے انداز دکھایا کرتا ہے

کبھی وہ ننھا بچہ بن کر میرے سامنے آتا ہے

کبھی وُہ اپنا خون بہا کر میرے جی کو ڈراتا ہے

کبھی کسی ہنس مُکھ عورت کی طرح مجھے بہلاتا ہے

پھر آنکھوں سے اشارہ کر کے کمرے میں چھُپ جاتا ہے

اسی طرح وہ نئے نئے انداز دکھایا کرتا ہے

جب کوئی اس کو گھور کے دیکھے ناز دکھایا کرتا ہے

ابھیمان

میرے سوا اس سارے جگ میں کوئی نہیں دل والا
میں ہی وہ ہوں جس کی چِتا سے گھر گھر ہُوا اُجالا
میرے ہی ہونٹوں سے لگا ہے نیلے زہر کا پیالا
میری طرح کوئی اپنے لہو سے ہولی کھیل کے دیکھے
کالے کٹھن پہاڑ دکھوں کے سر پہ جھیل کے دیکھے

جگمگ جگمگ کرتی آنکھیں ہیرے جیسے گال
جادو ہے ہونٹوں میں اس کے بجلی جیسی چال
اسکی حنائی مٹھی میں ہے عطر بھرا رومال
جس کی مہک سے شہر بنا ہے خوشبوؤں کا جال

جو اس سارے جگ میں نہیں ہے اس کی چاہ میں مرنا
یہ تو پاگل پن ہے لوگو، ایسا کبھی نہ کرنا

شیش محل

کس سے ملوں اور کس سے بچھڑوں اس جادو کے میلے میں
آنکھیں اور دل دونوں مل کر پڑ گئے عجب جھمیلے میں

سب کی آنکھیں سجی ہوئی ہیں ارمانوں کے پھولوں سے
سب کے دل گھبرائے ہوئے ہیں چاہ کے تند بگولوں سے

حیرت کی تصویر بنا ہوں رنگ برنگے چہروں میں
ایسا جو مجھ کو بہلائے، کوئی نہیں بے مہروں میں

تنہائی

میں، نگہت اور سُونا گھر
تیز ہوا میں بجتے در
لمبے صحن کے آخر پہ
لال گلاب کا تنہا پھول

اب مَیں اور یہ سُونا گھر
تیز ہوا میں بجتے در
دیواروں پہ گہرا غم
کرتی ہے آنکھوں کو نم
گئے دنوں کی اُڑتی دھول

چور دروازے

نگہت کی آنکھوں میں گہرے رازوں کی کچھ باتیں ہیں
سات سمندر پار کے شہروں کی کالی برساتیں ہیں
دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رونے والی راتیں ہیں

نگہت کے بکھرے بالوں میں سکھ کا خزانہ ملتا ہے
دل کو عجب خیالوں میں رہنے کا بہانہ ملتا ہے
ایک گلابی پھول مہک کے طوفانوں میں کھلتا ہے
کسی پرانی خواب گاہ کا ریشمی پردہ ہلتا ہے

غزل

رات یوں تو جو ادا تیری تھی محبوبانہ تھی
پھر بھی کیا شے اک تری وہ چشمک بیگانہ تھی

جب سفر سے لوٹ کر آئے تو کتنا دُکھ ہوا
اُس پرانے بام پر وہ صورتِ زیبا نہ تھی

کیا فراقِ یار کے قصّے پہ آنکھیں نم کریں
دل سے شعلے کا مقدر صحبتِ دریا نہ تھی

وہ کسی کی تیز نظریں تھیں اور اپنا ہی لہو
گرمیٔ محفل کا باعث تندیٔ صہبا نہ تھی

کیسے اپنے حال کی ان کو خبر ہوتی منیرؔ
خامشی دیوار و در کی کچھ لبِ گویا نہ تھی

میں، وہ اور رات

کمرے میں خاموشی ہے اور باہر رات بہت کالی سی ہے
اُونچے اونچے پیڑوں پر سیاہی نے چھاؤنی ڈالی سی ہے
تیز ہوا کہتی ہے پل میں برکھا آنے والی سی ہے

وہ سولہ سنگار کیے اپنی ہی سوچ میں کھوئی ہوئی ہے
سانسوں میں وہ گہرا پن ہے جیسے بے سُدھ سوئی ہوئی ہے
دل میں سو ارمان ہیں لیکن میری سمت نگاہ نہیں ہے
یوں بیٹھی ہے جیسے اس کے دل میں کسی کی چاہ نہیں ہے

دُکھ کی بات

بچھڑ گئے تو پھر بھی ملیں گے ہم دونوں اک بار
یا اس بستی دنیا میں یا اس کی حدوں سے پار
لیکن غم ہے تو بس اتنا جب ہم وہاں ملیں گے
ایک دوسرے کو ہم کیسے تب پہچان سکیں گے
یہی سوچتے اپنی جگہ پر چپ چپ کھڑے رہیں گے
اس سے پہلے بھی ہم دونوں کہیں ضرور ملے تھے
یہ پہچان کے نئے شگوفے پہلے کہاں کھلے تھے
یا اس بستی دنیا میں یا اس کی حدوں سے پار
بچھڑ گئے ہیں مل کر دونوں پہلے بھی اک بار

صدا بصحرا

چاروں سمت اندھیرا گھپ ہے اور گھٹا گھنگھور
وُہ کہتی ہے "کون ــــ؟"
میں کہتا ہوں "میں ــــ"
کھولو یہ بھاری دروازہ
مجھ کو اندر آنے دو ــــ"
اس کے بعد اک لمبی چُپ اور تیز ہوا کا شور

خوابِ گاہ

سامنے ہے اک تماشائے بہارِ جانفستاں
جابجا بکھری ہوئی خوشبو کی خالی شیشیاں
نیم وا ہونٹوں پہ سُرخی کے بہت مدھم نشاں
ریشمی تکیے میں پیوست اس کی رنگیں انگلیاں

دیکھ اے دل، شوق سے یہ آرزو کا کارواں
رنگ و بُو کے سلسلے، لعل و گہر کی وادیاں
پھر نہ جانے تو کہاں اور یہ حسین منظر کہاں

خوشی کا گیت

بیت گیا طوفان پریت کا
بیت گیا طوفان
ساری رات کٹھن بیتی کتنی جیسے جلے پہاڑ
درد کا بادل گرجا جیسے بندوقوں کی باڑ
بجلی بن کر کڑک رہے تھے چاہت کے ارمان
بیت گیا طوفان
ختم ہوا وہ ارمانوں کے پاگل پن کا زور
مدھم ہو کر مٹا سلگتی تیز ہوا کا شور
دہک دہک کر بجھ گیا آخر یہ دل کا شمشان
بیت گیا طوفان

ایک رات کی بات

باہر بارش برس برس کر
میٹھے گیت سُناتی ہے
اور کمرے کے اندر نکہت
مجھ کو دیکھے جاتی ہے
میں شرما کر کہتا ہوں
"دیکھو! یہ اچھی بات نہیں
اسی طرح کے پاگل پن میں
بیت نہ جائے رات کہیں"

جادُوگر

جب میرا جی چاہے میں جادو کے کھیل دکھا سکتا ہوں
آندھی بن کر چل سکتا ہوں بادل بن کر چھا سکتا ہوں
ہاتھ کے ایک اشارے سے پانی میں آگ لگا سکتا ہوں
راکھ کے ڈھیر سے تازہ رنگوں والے پُھول اُگا سکتا ہوں
اتنے اُونچے آسمان کے تارے توڑ کے لا سکتا ہوں

میری عمر تو بس ایسے ہی کھیل دکھاتے گزُری ہے
اپنی سانس کے شعلوں سے گلزار کھلاتے گزُری ہے
جھوٹی سچی باتوں کے بازار سجاتے گزری ہے
پتھر کی دیواروں کو سنگیت سُناتے گزری ہے
اپنے درد کو دنیا کی نظروں سے چھپاتے گزری ہے

غزل

ہوائے شوق کے رنگیں دیار جلنے لگے
ہوئی جو شام تو جھکڑ عجیب چلنے لگے

نشیبِ در کی مہک راستے سجھانے لگی
فرازِ بام کے مہتاب دل میں ڈھلنے لگے

وہاں رہے ہیں تو کسی نے بھی ہنس کے بات نہ کی
چلے وطن سے تو سب یار ہاتھ ملنے لگے

ابھی ہے وقت چلو چل کے اس کو دیکھ آئیں
نہ جانے شمسِ رواں کب لہو اُگلنے لگے

منیر پھولوں سے چہرے پہ اشک ڈھلکے ہیں
کہ جیسے لعل سمِ رنگ سے پگھلنے لگے

ایک پُرانی رِیت

جو بھی گھر سے جاتا ہے
یہ کہہ کر ہی جاتا ہے
"دیکھو، مجھ کو بھول نہ جانا
میں پھر لوٹ کے آؤں گا
دل کو اچھے لگنے والے
لاکھوں تحفے لاؤں گا
نئے نئے لوگوں کی باتیں
آ کر تمہیں سناؤں گا"
لیکن آنکھیں تھک جاتی ہیں
وہ واپس نہیں آتا ہے
لوگ بہت ہیں اور وہ اکیلا
ان میں گم ہو جاتا ہے

ایک آسیبی رات

کافی دیر گزرنے پر بھی جب وہ گھر نہیں آئی
اور باہر کے آسمان پہ کالا بادل کڑکا
تو میرا دل ایک نرالے اندیشے سے دھڑکا

لالٹین کو ہاتھ میں لے کر جب میں باہر نکلا
دروازے کے پاس ہی اک آسیب نے مجھ کو ٹوکا
آندھی اور طوفان نے آگے بڑھ کر رستہ روکا

تیز ہوا نے رو کے کہا "تم کہاں چلے ہو بھائی
یہ تو ایسی رات ہے جس میں زہر کی موج چھپی ہے
جی کو ڈرانے والی آوازوں کی فوج چھپی ہے"

میں نے پاگل پن کی دھن میں مڑ کر بھی نہیں دیکھا
دل نے تو دیکھے ہیں ایسے لاکھوں کٹھن زمانے
وہ کیسے ان بھوتوں کی باتوں کو سچا جانے

جونہی اچانک میری نظر کے سامنے بجلی چمکی
میں نے جیسے خواب میں دیکھا اک خونیں نظارا
جس نے میرے دل میں گہرے درد کا بھالا مارا
خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی اک ننگی مہ پارا

پھر گھایل چیخوں نے مل کر دہشت سی پھیلائی
رات کے عفریتوں کا لشکر مجھے ڈرانے آیا
دیکھ نہ سکنے والی شکلوں نے جی کو دہلایا

ہیبت ناک چڑیلوں نے ہنس ہنس کر تیر چلائے
سائیں سائیں کرتی ہوا نے خوف کے محل بنائے

سارے تن کا زور لگا کر میں نے اسے بلایا
"لیلےٰ لیلےٰ کہاں ہو تم"؟ اب جلدی گھر

"لیلےٰ۔ لیلےٰ۔ کہاں ہو تم"
لیلےٰ۔ لیلےٰ۔ کہاں ہو تم
عفریتوں نے مری صدا کو اسی طرح دُہرایا

منہ دھو کر جب اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا
مجھ کو یہ محسوس ہوا جیسے کوئی بجلی چمکی ہے
یا جنگل کے اندھیرے میں جادو کی انگوٹھی دمکی ہے

صابن کی بھینی خوشبو سے مہک گیا دالان
اُف اُن بھیگی بھیگی آنکھوں میں دل کے ارمان
موتیوں جیسے دانتوں میں وہ گہری سرخ زبان
دیکھ کے گال پہ ناخن کا مدھم سا لال نشان
کوئی بھی ہوتا میری جگہ پہ ، ہو جاتا حیران

غزل

رات فلک پہ رنگ برنگی آگ کے گولے چھوٹے
پھر بارش وہ زور سے برسی مہک اُٹھے گل بُوٹے

اس کی آنکھ کے جادو کی ہر ایک کہانی سچّی
میرے دل کے خُوں ہونے کے سب افسانے جھُوٹے

پہلے پہل تو جی نہ لگا پردیس کے ان لوگوں میں
رفتہ رفتہ اپنے ہی گھر سے سارے ناطے ٹوٹے

یہ تو سچ ہے سب نے مِل کر دلجوئی بھی کی تھی
اپنی رسوائی کے مزے بھی سب یاروں نے لُوٹے

میں جو منیرؔ اک کمرے کی کھڑکی کے پاس سے گزرا
اس کی چِق کی تیلیوں سے ریشم کے شگوفے پھُوٹے

ایک پہیلی

آنکھوں میں اندھیری رین بھی ہے
میری ہی طرح بے چین بھی ہے
پر اس کی اپنی شان بھی ہے
ہونٹوں پہ عجب مسکان بھی ہے
اور منہ میں رنگیلا پان بھی ہے
جب دیکھیں تو شرماتی ہے
جب چاہیں تو گھبراتی ہے

مَیں اور وہ

روزِ ازل سے وہ بھی مجھ تک آنے کی کوشش میں ہے
روزِ ازل سے میں بھی اس سے ملنے کی کوشش میں ہوں
لیکن میں اور وہ ــــ ہم دونوں
اپنی اپنی شکلوں جیسے لاکھوں گورکھ دھندوں میں
چُپ چُپ اور حیران کھڑے ہیں
کون ہے "میں"
اور کون ہے "تو"
بس اسی درد میں کھوئے ہوئے ہیں
صبح کو ملنے والے سمجھیں
جیسے یہ تو روئے ہوئے ہیں

بچّوں جیسی باتیں

آج کا کام نہ کل پر ٹالو
جو کچھ لکھنا ہے لکھ ڈالو
اِدھر اُدھر کی جھُوٹی باتیں
ذرا ذرا سی جیتیں ماتیں
جانے پھر کب موت آجائے
دل کی دل ہی میں رہ جائے

قطعہ

شہ نشینوں پہ جھکے ہیں رنگ میں بھیگے سحاب
بہہ رہی ہے کو بکو ان تیز آنکھوں کی شراب
اِک نسائی سانس کی خوشبوؤں میں لپٹا ہُوا
کتنا پر اسرار لگتا ہے یہ ماہِ نیم تاب

قطعہ

کچھ عیشِ رائیگاں کی بھی جادوگری ہوئی
کچھ یادِ رفتگاں سے طبیعت ڈری ہوئی
بیٹھے ہوئے ہیں شہرِ نگاراں کے روبرو
چلتی ہے بادِ شام غموں سے بھری ہوئی

گیت

تم جلتی رہو ـــــ تم جلتی رہو
ساون کی اندھیری راتوں میں
بادل سے بھری برساتوں میں
چُپ رہ کر دُکھ کی پیڑ سہو
تم جلتی رہو

جب پشپ لتا کا شور بڑھے
اور کامناؤں کا زور بڑھے
تب کومل، کانپتے ہردے سے
تم مدُھر مِلن کے گیت کہو
تم جلتی رہو

پھر پریتم پیارا آئے گا
ہر دُکھ پل میں مٹ جائے گا
اُس سمے کے دھیان میں مست رہو
تم جلتی رہو

گیت

کس کس سے ہم پریت نبھائیں
کون سی مورت من میں بٹھائیں
سانجھ سویرے کس کو ڈھونڈنے
کُنج گلیوں میں جائیں
کس سے پریت نبھائیں

نت نئی اک سندر ناری
ہردے بیچ سمائے
جس ناری کو میں چاہوں
وہ دُور کھڑی شرمائے
ایسے بھید سمجھ نہ آئیں

لو پھر سانجھ سہانی آئی
دھیان میں لاکھوں باتیں لائی
سُونے گھر میں سندریوں نے
نینن جوت جلائی!
کس رادھا سنگ راس رچائیں

گیت

رادھا کے کومل ہردے میں کرے کامنا زور
اُس کے سُندر دھیان میں گونجے کوئلیا کا شور
رادھا کے چنچل نینوں میں چھائی گھٹا گھنگھور

آتے جاتے جھونکے اس کو دُکھ کے راگ سنائیں
بندرابن کی چنچل ناریں ہنس ہنس جی کو جلائیں
سوتن کے سنگ راس رچائے نرموہی چیت چور

دن ڈھلتے ہی ہر آنگن میں
سُکھ کا جادو چھائے
جس کے درس کو رادھا ترسے
وہ موہن کب آئے
بول رے من کے مور

گیت

لو پھر سانولی رجنی نے تاروں بھرا آنچل لہرایا
بیتے ہوئے سب سمے سہانے
گاتے ہوئے اب گیت پرانے
آ گئے دل کا درد بڑھانے
دھیرے دھیرے سونے نگر پہ پھیلی دکھ کی چھایا
روپ نگر کے رہنے والو
جھوٹے سپنوں کے متوالو
آنکھوں کو کاجل سے سنوارو
پھولوں کو بالوں سے سجا لو
بھور ہوئی تو مٹ جائے گی سندر رات کی مایا
گئے سمے کا سوگ منائیں
چندرماں کی جوت جلائیں
سندرتا کی دھوم مچائیں
ایسی ہی کتنی سوچوں سے جیون کا پنچھی گھبرایا

گیت

بات تو دیکھو پاگل من کی
چاہ کرے اُس کے جوبن کی
جس کا بسیرا ہے سچ گگن کی
باتیں دیکھو پاگل من کی

جب دن کا دیپک بجھ جائے
اُمڈ گھمنڈ کر بادل چھائے
اک ناری شرماتی آئے
آئیں گھڑیاں مدھر ملن کی

سپنے کب سچے ہوتے ہیں
پریمی تو یونہی روتے ہیں
جلتی رہے گی جوت لگن کی

گیت

رات اندھیری، بادل برسے
جیارا دھڑکے موہن ڈرسے
وہ دیکھو! اک سُندر ناری
پیا مِلن کو نکلی گھر سے
جھُوم جھوم کر بادل برسے

پریم نگر کے لوگو! آؤ!!
اس ناری کی دھیر بندھاؤ
ہر سُونے اندھیارے پتھ پر
مِلن گیت کے دیپ جلاؤ
گوری آئی روپ نگر سے

دیکھو رے اک سُندر ناری
پیا ملن کو نکلی گھر سے
جھُوم جھُوم کر بادل برسے

گیت

من مورکھ کی ایک نہ مانو
اس کے موہ کو جھوٹا جانو
اس کا کام ہے دھوکا کھانا
بنجاروں سے من نہ لگانا

بستی بستی گھومنے والے
رس کے لوبھی، یہ متوالے
نربل سندریوں کے من میں
چاہ کی آگ لگانے والے
ان کی باتوں میں مت آنا

پل بھر کی پہچان ہے ان کی
دو گھڑیوں کا میل
آن کی آن میں مٹ جاتا ہے
ان کی پیت کا کھیل
یہ کیا جانیں لاج نبھانا

ڈوب گیا اب شام کا سورج آئی کالی رات
اب تو دل میں درد بسے گا نینوں میں برسات
آئی کالی رات

پی درشن کو سج کر نکلی ہر البیلی نار
دور دیس کی رادھا جائے کس موہن کے دوار
کیسے بنے گی بات

ندی کنارے گانے والو، سُونے دوار بساؤ
بچھڑ گئے جو میت پرانے رو رو انھیں بلاؤ
ہوئی پریت کی مات

جنگل میں دھنک

مُنیر نیازی

○

قدرت اللہ شہاب کے نام ____

ترتیب

؛؛ ؛؛ ؛؛

تعارُف

ڈرتا ہوں منیر نیازی اور اس کی شاعری کے بارے میں یہ چند سطور لکھتے وقت میری نظروں کے سامنے اس کی شخصیت کا وہ رُخ نہ آجائے جس پر اس کی اور میری دوستی کے خدوخال ہیں۔ زندگی کا ایک حصہ ہم نے ایک دُوسرے کے قریب ایک ہی فضا اور ایک ہی شہر میں گزارا ہے۔ میں ہمیشہ اس کی صلاحیتوں کا معترف رہا ہوں لیکن جو کچھ میں اب لکھنا چاہتا ہوں وہ صرف بحیثیت ایک ہم قلم کے ہے۔ اس کے کلام کے بارے میں جو کچھ میرا تاثر ہے اس کے اظہار میں میں اپنے ذاتی تعلقات کو مخل نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے سب سے زیادہ اس کی شاعری کی وہ فضا پسند ہے، وہ فضا، جو اس کی زندگی کے واقعات، اس کے ذاتی محسوسات اور اس کی شخصیّت کی طبعی افتاد سے اُبھرتی ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے جذبے کی صداقت کے ساتھ لکھا ہے۔ اور اس کے احساسات کسی عالمِ بالا کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس کی اپنی زندگی کی سطح پر کھیلنے والی لہریں ہیں۔ انہی نازک، چنچل، بے تاب، دھڑکتی ہوئی لہروں کو اس نے شعروں کی سطروں میں ڈھال دیا ہے، اور اس کوشش میں اس نے انسانی جذبے کے ایسے گریزپا پہلوؤں کو بھی اپنے شعر کے جادو سے اُجاگر کر دیا ہے جو اس سے پہلے اس طرح ادا نہیں ہُوئے تھے۔ یہی منیر نیازی کا

کمالِ فن ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی بدبختی۔ وہ لوگ، اور پاکستان میں لاکھوں ایسے انسان بستے ہیں جو ایک مانوس طرزِ فکر، ایک بنے بنائے، واضح و معین اندازِ اظہار اور ایک روندے ہوئے اسلوبِ بیان کو قرنوں سے دیکھتے آئے تھے، اس نئی آواز کی معنی اندوز لطافتوں سے اخذِ کیف نہ کرسکے۔ کہنے والوں نے جو کچھ منہ میں آیا کہہ دیا۔ شاید یہ لوگ سچے تھے۔ شاید منیر نیازی نے جو کچھ لکھا ان کے لیے نہیں لکھا تھا۔ جب قاری کی طرف سے ردِ عمل اس قسم کا ہو تو شاعر کا انجام معلوم! چنانچہ منیر نیازی کو جو سزا ملی کس سے مخفی ہے؛ زمانہ شاعر کو یہی کچھ دیتا ہے! ہمارے اس معاشرے میں ہر چیز کو سونے کی میزان میں تولا جاتا ہے۔ یہ کون جانتا ہے کہ جس کے دامن میں خوبصورت نظموں کے پھول تھے اُس کو اس بھری دُنیا میں کیا کیا مصائب جھیلنے پڑے۔ یہ سب کچھ میں اس لیے نہیں جانتا کہ میں منیر کا دوست ہوں۔ لاہور کے در و دیوار سے۔ لاہور کے رنگین راستوں اور حسین فضاؤں سے آپ پوچھ لیجیے کس طرح ایک شعلوں میں لتھڑی ہوئی روح صرف شعر کی لگن میں کتنی بے خواب راتوں کی گہری چپ میں اس طرح سرگرداں رہی ہے جیسے اسے نانِ جویں کی بھی طلب نہ تھی۔ اور لوگوں کے ساتھ تال بجاتے داد گروں کی ٹولیاں تھیں، عظیم نظریوں کے کوکبہ ہائے جلال تھے، مسندیں تھیں، اورنگ تھے۔ منیر نیازی کے پاس کیا تھا؛ کوئی سایۂ دیوار بھی نہ تھا۔ صرف شعر کہنے کی دُھن۔ یوں اپنے آپ میں تنہا اس نے اپنی زندگی کی ایک ایک تڑپ، اپنے

تجربات کی ایک ایک کسک ہوا کے جھونکوں کی سلوٹوں سے تراشی ہوئی سطور کے اندر رکھ دی۔ آج زر و سیم کی قدروں میں کھوئی ہوئی یہ مخلوق جنگل کی اس دھنک کو کیا دیکھے گی! اس صحیفے کو رکھ دو۔ سجا کر رکھ دو اُس اونچی الماری میں! ابھی اس بازار سے جانے کتنی نسلوں کے جلوس اور گزریں گے! یہ جلوس ہنستے کھیلتے، قہقہے لگاتے مہ و سال کے غبار میں کھو جائیں گے۔ زمانے کی گرد میں۔ ہم سب اسی گرد کا حصہ ہیں۔ ہم سب اور منیر بھی۔ لیکن خیال اور جذبے کی ان دیکھی دنیاؤں کے پرتو فطرت کے رنگوں اور خوشبوؤں میں تحلیل ہوتی نظروں کی جاگرتی، تیرتی بدلیوں کے سایوں میں رُوتے دلوں کی کروٹ جو اس کے شعروں اور شبدوں میں مجسم اور جاوید ہو کر رہ گئی ہے اُردو نظم کے مرحلہ ہائے ارتقاء کی ایک جاندار کڑی ہے۔ کون ان نقوش کو بھلا سکے گا۔ وہ خود کہتا ہے:۔

مری طرح کوئی اپنے لہو سے ہولی کھیل کے دیکھے
کالے کٹھن پہاڑ دکھوں کے سر پہ جھیل کے دیکھے
میرے ہی ہونٹوں سے لگا ہے نیلے زہر کا پیالہ
میں ہی وہ ہوں جس کی چتا سے گھر گھر ہوا اُجالا

مجید امجد

دُور کا مُسافر

کل دیکھا اِک آدمی ، اَٹا سفر کی دُھول میں
گُم تھا اپنے آپ میں ، جیسے خُوشبو پھُول میں

ماضی

یہ کہنہ محل جس کے رنگیں دریچوں سے لپٹی ہُوئی عشق پیچاں کی بیلیں
منڈیروں، ستونوں پہ پھیلی ہُوئی سبز کائی
سرِ شام چلتے ہُوئے سرد جھونکوں میں سسکاریاں بھر رہی ہے
جہاں اب ہوا، اُس کے پائیں چمن کے خزاں دیدہ پیڑوں کی شاخوں
پہ سرگوشیوں کے شگوفے کھلانے سے شرما رہی ہے
یہاں - ایک دن تھا کہ شیریں صداؤں کے جُھنڈ
آرزوؤں کے بھٹکے ہُوئے قافلوں کے لیے راحتوں کے نشاں تھے

یہاں ہر دریچہ
حسیں، ہمہماتے، وفا کیش چہروں کی آماجگاہ تھا
یہ باغ ان گنت خوشبوؤں، چہچہاتے پرندوں،
گھنیرے درختوں کی اک دل نشیں جلوہ گہ تھا
یہ چپ چاپ سنگیں عمارت، تب اتنی پرانی نہیں تھی
مگر آج جس سمت دیکھو
نگاہوں کے کشکول ہیں
سُونے بام و در و سقف
سوکھے درختوں سے جھڑ کر گرے زرد پتوں، چٹختی ہُوئی ٹہنیوں کے
سوا کچھ نہیں ہے!

تُو

وہاں، جس جگہ پر صدا سو گئی ہے
ہر اک سمت اُونچے درختوں کے جُھنڈ
ان گنت سانس روکے ہُوئے چُپ کھڑے ہیں
جہاں ابر آلود شام اُڑتے لمحوں کو روکے ابد بن گئی ہے
وہاں، عشقِ پیچاں کی بیلوں میں لپٹا ہُوا اک مکاں ہو!
اگر میں کبھی راہ چلتے ہُوئے اُس مکاں کے دریچوں کے
نیچے سے گزروں
تو اپنی نگاہوں میں اک آنے والے مُسافر کی
دُھندلی تمنا لیے تُو کھڑی ہو!

قفسِ رنگ

بہت دن ہوئے
مَیں نے اِک بادلوں سے بھری صُبح کو
خوابگہ کے دریچے سے جھانکا
تو پائیں چمن کا ہراک پھُول
حیرت زدہ لڑکیوں کی لجائی ہوئی آنکھ کی طرح
میری طرف تک رہا تھا !

مجُھے بھُول کر
اپنے بسنے گھروندوں میں ہنستی ہوئی لڑکیو !
مجھ کو اُس بادلوں سے بھری صبح کے
گہری حیرت میں گم، شرم آلود پھولوں کی مانند
تمہیں دیکھ کر کانپ اُٹھنے کی
وہ اوّلیں ساعتیں یاد ہیں !

سائے

کسی سائے کا نقش گہرا نہیں ہے
ہر اِک سایہ اک آنکھ ہے
جس میں عشرت کدوں، نارسا خواہشوں
ان کہی دل نشیں داستانوں کا میلہ لگا ہے
مگر آنکھ کا سحر
پلکوں کی چلمن کی ہلکی سی جنبش ہے
اور کچھ نہیں ہے
کسی آنکھ کا سحر دائم نہیں ہے

ہر اِک سایہ
چلتی ہوا کا پُر اسرار جھونکا ہے
جو دُور کی بات سے
دل کو بے چین کر کے چلا جائے گا
ہر کوئی جانتا ہے
ہواؤں کی باتیں کبھی دیر تک رہنے والی نہیں ہیں
کسی آنکھ کا سحر دائم نہیں ہے
کسی سائے کا نقش گہرا نہیں ہے

ایسی کئی شامیں

ابھی سرد، بوجھل ہوا جی اُٹھے گی
ابھی ناریل کے درختوں پہ، ساحل پہ
چھا جائے گا اک نشیلا اندھیرا
معطّر لبوں، مدھ بھری دھیمی باتوں
کے انبوہ ہر سمت آوارہ ہوں گے
ابھی آرزوؤں کے بے حرف کتبے
اُبھر آئیں گے
بے گل و برگ یادوں کی اُجڑی ہُوئی بستیوں سے
یہیں تیرگی ہیں،
میں چپ چاپ گزرے زمانوں کی قبروں کو گنتا رہوں گا
بہت دُور ظلمت کے قاصد ستارے چمکتے رہیں گے

ہزار داستان

جدھر بھی دیکھیں
مہکتے ہونٹوں کے سُرخ گلشن کھِلے ہُوئے ہیں
جہاں بھی جائیں
حیا کے نشّے سے چُور آنکھیں
دلوں میں گہری اُداسیوں کو اُتارتی ہیں
ہزار گوشے ہیں
جن سے پاگل بنانے والی
سیاہ زلفوں کی مست خوشبو اُمڈ رہی ہے
مگر وہ اک ایسا پیارا چہرہ
جو ایک رُت کے اُداس جھونکے
کے ساتھ آکر
چلا گیا ہے !

ہوا کا گیت

مرا راستہ روکنے کی نہ کوشش کرو

مَیں ہوا ہوں

مری کھوج میں جنگلوں، گلستانوں، پہاڑوں، پُرانے مکانوں

میں جاؤ گے تو ایک جانکاہ دُکھ کے سوا

اور کچھ بھی نہیں مل سکے گا

سیہ کالی راتوں میں

ہلکی سی آہٹ پہ اُٹھ کر

سُلگتی نگاہوں سے چاروں طرف تکنے والو

کوئی تم میں ایسا بھی ہے ؟

جو رواں ندیوں، راہ چلتی صداؤں کو باہوں کے گھیرے میں لے کر دکھا دے

چلے جانے والوں کو اک بار واپس بُلا کر دکھا دے

کوششِ رائیگاں

ابھی چاند نکلا نہیں
وہ ذرا دیر میں اُن درختوں کے پیچھے سے اُبھرے گا
اور آسماں کے بڑے دشت کو
پار کرنے کی اک اور کوشش کرے گا

فریب

شام ہونے کو ہے
شام ہوتے ہی سُکھ سے بھری اک صدا
جنگلوں سے گزرتی ہوئی آئے گی
دشتِ غربت کی ٹھنڈی ہوا
اپنے پیاروں سے دُور
اجنبی راستوں پر بھٹکتے دلوں کو سُلا جائے گی

نارسائی

مرا دل محبت کا بھوکا
بلند، اُونچے پیڑوں کے جنگل
میں چلتے ہُوئے رہروؤں سے یہ کہتا ہے :
" مجھ کو اُٹھا لو ـــــ
مُجھے اپنے ساتھ اُن المناک رستوں میں لے کر چلو
جن میں ہر آرزو شام کی راگنی بن گئی ہے
جہاں ہر صدا بھیگے سایوں کی خاموش محراب میں چھپ گئی ہے
حسیں رہرو !
میں تمہارے اکیلے گھروں میں
تمہاری حزیں چاہتوں کے غم افروز گیتوں پہ رویا کروں گا ! "

مرا دل محبت کا بھوکا
اسی طرح صدیوں سے چاہت کا کشکول لے کر
گھنے جنگلوں کے حسیں رہروؤں سے کہے جا رہا ہے :
" مجھے ساتھ لے کر چلو
اجنبی راستوں پر بھٹکتے ہوئے اجنبی دوستو ! "

خوشبو کے رنگ

خوشبو کے اس جھونکے میں
کچھ اونچے سرد مکانوں کی
اک لمبی چوڑ گلی ہے
اس میں اک آواز کا جادو
رنگ جمانے آیا
ریشمی کپڑوں کا انگارہ
آگ لگانے آیا
بھولی ہوئی شکلوں کا بادل
نیر بہانے آیا

گُلِ صد رنگ

کبھی چمکتے ہُوئے چاند کی طرح روشن
کبھی طویل شبِ ہجر کی طرح غمگیں
شعاعِ لعلِ حنا کی طرح مہکتی ہوئیں
کبھی سیاہیٔ کوہِ ندا میں پردہ نشیں

سنبھل کے دیکھ طلسمات اُن نگاہوں کا
دلِ تباہ کی رنگیں پناہ گاہوں کا

گوہرِ مُراد

شاموں کی بڑھتی تیرگی میں
برکھا کے سُونے جنگل میں
کبھی چاند کی مٹتی روشنی میں
رنگوں کی بہتی نہروں میں
ان اُونچی اُونچی کھڑکیوں والے
اُجڑے اُجڑے شہروں میں
کن جانے والے لوگوں کی
یادوں کے دیے جلاتے ہو؟
کن بھُولی بسری شکلوں کو
گلیوں میں ڈھونڈنے جاتے ہو؟

موسمِ بہار کی دوپہر

ہلکی ہلکی گرم ہوا میں ہلکی ہلکی گرد
ویراں مسجد کے پیچھے تھوہر کی سبز قطار
اُس کے عقب میں لال اور نیلے پھولوں کے انبار
اُونچے اُونچے پیڑ ہیں جیسے لمبے لمبے مرد

یا سُنسان قلعے کی خاکی ، اُجڑی سی دیوار
جس کے نیچے چھپے ہُوئے کچھ دشمن کے سردار
ہاتھ میں پکڑے جگمگ کرتے سُورج کی تلوار
چور آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں رنگوں کا تہوار

زندگی

شام کا سورج خود اپنے ہی لہو کی دھاریوں میں ڈوب کر
دیکھتا ہے بجھتی آنکھوں سے سوادِ شہر کے سُونے کھنڈر
اس کو لے جائے گی پل بھر میں فنا کے گھاٹ پر
رات کے بحرِ سیہ کی موج ہے گرمِ سفر

دیکھتی آنکھوں افق کے سرد ساحل پر اندھیرا چھائے گا
ڈوبتا سورج ابھی بھولے دنوں کی داستاں بن جائے گا

سرسراتے ریشمی سایوں سے بھر جائے گی ہر اک رہگزر
نازنیں آنکھوں کی صورت ٹمٹمائیں گے خیالوں کے نگر
تیز سانسوں کی مہک اُڑتی پھرے گی رات بھر
تُو بھی خوش ہو، میرے دل! نوحہ گرِ شام و سحر!!

پُراسرار چیزیں

جب بھی تارا گرے گا اُس پر
اُس کا دل تو کانپے گا
نئی نئی خواہش کا چیتا
بڑے زور سے ہانپے گا

اِتنا اُونچا اُڑ رہے پتّے
جتنے اُونچے تارے ہیں
جو دھرتی کو دُور سے تکتی
آنکھ کو کتنے پیارے ہیں

طوفانی رات میں انتظار

اُس کے ریشمیں کپڑے ہیں یا تیز ہوا کا زور
چھن چھن کرتی پازیبیں ہیں یا پتّوں کا شور
آنکھیں نیند سے بوجھل ہیں پر دل بھی ہے بےچین
اسی طرح سے کٹ جائے گی کاجل جیسی رین

تسلّی

ابھی اور کچھ دن اکیلے پھرو
ہواؤں سے دل کی کہانی کہو

سیہ بادلوں سنگ روتے رہو
کبھی چاند کو تک کے آہیں بھرو

بہت جلد وہ شام بھی آئے گی
نئی چھب نگاہوں کو بہلائے گی

مہک گزری باتوں کی مٹ جائے گی
کوئی یاد دل میں نہیں آئے گی

گاؤں کا میلہ

میلہ ہے یہ گاؤں کا، سب ڈھول بجاتے آؤ
وحشی خوں کی موجوں کو طوفان بناتے آؤ
گھر میں چھپے ہوئے چوروں کا دل دہلاتے آؤ
جسم کی پُراسرار مہک کی آگ جلاتے آؤ

اُونچے نیلے آسمان پر جھولے چڑھتے دیکھو
جادو کے سانپوں کو چھپ کر آگے بڑھتے دیکھو
بچوں والی دُوربین میں تارے جھڑتے دیکھو
سب رنگوں کو بھاگ کر چور پکڑتے دیکھو

تُو اَور وہ

ایک تیسرا شخص ہے ایسا جس کی شکل بھی میری ہے
اُس نے میرے دل کی دنیا عجب رنگ سے گھیری ہے

سامنے تو کبھی آتا نہیں پر چُھپ کر تکتا رہتا ہے
میرے مکاں کی دیواروں کے پرے بھٹکتا رہتا ہے

جانے کب دیوار پھاند کر چُپکے چُپکے آئے گا
تیری نئی تصویر اُٹھا کر اُسی طرح چُھپ جائے گا

اُسی سے ڈر کے تجھ سے جھوٹا پیار جتانا پڑتا ہے
جی نہیں کرتا پھر بھی تیرے سامنے آنا پڑتا ہے

ایک خواہش

یخ آلود، ٹھنڈی ہوا

بادلوں سے بھری شام ہو

اور طوفاں زدہ بحر کی تُند موجوں کی مانند

آوازیں دیتے ہُوئے پیڑ ہوں

شہر کی سُونی گلیوں میں اُڑتے ہُوئے خشک پتوں .

پُراسرار دروازے کھلنے کی مدھم صدا .

ریشمی پیرہن سرسرانے کی خوشبوؤں کا شور ہو

اور ہم چُپکے بیٹھے

کسی کی جفائیں . کسی کی وفا یاد کرتے ہُوئے

اپنے بے چین دل کو سُلاتے رہیں

خواہش اور خوابؔ

اجنبی شکلوں سے جیسے کچھ شناسائی بھی تھی
چاند کچھ نکلا ہوا تھا ۔ کچھ گھٹا چھائی بھی تھی

ایک عورت پاس آکر مجھ کو یوں تکنے لگی
جیسے میری آنکھ میں کوئی دیکھنے کی چیز تھی

دفعتاً لپٹی جو مجھ سے کیا بتاؤں دوستو
وہ گھڑی بیتی جو مجھ پہ کیا سناؤں دوستو
زخم جو دل پر لگے اب کیا دکھاؤں دوستو

جسم کی گرمی اور اُس کا درد اب تک یاد ہے
ایک نا آسودہ آہِ سرد اب تک یاد ہے

خواہش کے خواب

گھر تھا یا کوئی اور جگہ جہاں میں نے رات گزاری تھی
یاد نہیں یہ ہوا بھی تھا یا وہم ہی کی عیاری تھی
ایک انار کا پیڑ باغ میں اور گھٹا منواری تھی
آس پاس کالے پربت کی چُپ کی دہشت طاری تھی
دروازے پر جانے کس کی مدھم دستک جاری تھی

جادو گھر

کسی مکاں میں کوئی مکیں ہے
جو سُرخ پھُولوں سے بھی حسیں ہے
وہ جس کی ہر بات دل نشیں ہے

کبھی کوئی اُس مکاں میں جائے
اور اُس حسینہ کو دیکھ پائے
تو دل میں اک درد لے کے آئے

بھرے جہاں میں عجب سماں ہے
جدھر بھی دیکھو وہی مکاں ہے
وہی مکاں — جو حریم جاں ہے

ساکت زندگی

چھت سے لگی دو آنکھیں اور دیواروں کی خاموشی
چھوٹی اینٹ کے فرش پہ نیلے ریشم کا رومال
ایک اندھیرے کمرے میں اک مرد عورت کی سرگوشی

نیم کھلے دروازے کی محراب سے کافی نیچے
لکڑی کی دھلیز پہ سوکھا اور بوسیدہ ہار
اُس سے پرے کچھ رنگ برنگے پھولوں کے باغیچے
گزر رہا ہُوں ایک گلی سے اپنی آنکھیں میچے

نگار خانہ

کسی کی شربتی نظر
کوئی مہکتا پیرہن
دمکتی سُرخ چوڑیاں!
چمکتا ریشمی بدن
کئی جھکے جھکے شجر
ہرے بنوں میں گھومتی
کوئی اُداس رہگزر
حنا کے رنگ میں بسے
کسی نگر کے بام و در
رہیں گے یاد عمر بھر

طلسمِ خیال

اَدھ کھُلے رنگیں نقابوں میں چمکتی بجلیاں
ہر بُنِ مُو سے اُڑتی نکہتوں کی ندّیاں
رہروانِ نیم شب کی جستجو میں چار سُو
راستوں پر پھر رہی ہیں شب کی جادو گرنیاں

شام کے مسحور کُن رنگوں میں ڈوبی مورتیں
دیدۂ بے خواب کی وسعت میں پنہاں ہوگئیں
عشق کے نشے میں چُور انجان پیاری لڑکیاں
نیند کی ٹھنڈی ہوا میں مست ہو کر سوگئیں

خزانے کا سانپ

ہلاکت خیز ہے اُلفت ، مری ہر سانس خُونی ہے
اسی باعث یہ محفل دل کی قبروں سے بھی سُونی ہے

اُسے زہریلی خوشبوؤں کے رنگیں ہار دیتا ہُوں
میں جس سے پیار کرتا ہُوں اُسی کو مار دیتا ہُوں

بھوتوں کی بستی

پیلے منہ اور وحشی آنکھیں
گلے میں زہری ناگ
لب پر سرخ لہو کے دھبّے
سر پر جلتی آگ

دل ہے ان بھوتوں کا یا کوئی
بے آباد مکان
چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا
اک لمبا قبرستان

چڑیلیں

گہری چاندنی راتوں میں یا گرمیوں کی دوپہروں میں
سُونے تنہا رستوں میں یا بہت پُرانے شہروں میں

نئی نئی شکلوں میں آ کر لوگوں کو پھسلاتی ہیں
پھر اپنے گھر لے جا کر ان سب کو کھا جاتی ہیں

اسی طرح وہ گرم لہو کی پیاس بُجھاتی رہتی ہیں
ویرانوں میں موت کا رنگیں جال بچھاتی رہتی ہیں

جسم کی خوشبو کے پیچھے دن رات بھٹکتی رہتی ہیں
لال آنکھوں سے رہگیروں کا رستہ تکتی رہتی ہیں

سپیرا

مَیں ہُوں ایک عجیب سپیرا
ناگ پالنا کام ہے میرا
پیلے پیلے ، کالے کالے
رنگ برنگے دھبّوں والے
شعلوں سی پھنکاروں والے
زہریلی مہکاروں والے
ان کی آنکھیں تیز نشیلی
گہری جھیلوں ایسی نیلی
نئے لہو سے لال زبانیں
جیسے موت کی رنگیں تانیں
مخمل کے رومالوں جیسے
سُرخ گلابی گالوں جیسے

مُجھ کو تکتے رہتے ہیں یہ
مُجھ کو ڈستے رہتے ہیں یہ
مُجھ پر ہنستے رہتے ہیں یہ

مَیں اَور شہر

سڑکوں پہ بے شمار گُلِ خوں پڑے ہُوئے
پیڑوں کی ڈالیوں سے تماشے جھڑے ہُوئے
کوٹھوں کی ممٹیوں پہ حسیں بُت کھڑے ہُوئے

سُنسان ہیں مکان کہیں در کُھلا نہیں
کمرے سجے ہُوئے ہیں مگر راستا نہیں
ویراں ہے پُورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہُوں کوئی بولتا نہیں

گلیوں میں ایک دن

یوں تو کواڑ کھولنے آئی تھی کتنے زور سے
سارا مکان بھر گیا اُس کی صدا کے شور سے

غصّے سے چہرہ سُرخ تھا، آنکھیں غضب بنی ہوئی
جوشِ جہاں شکست سے پوری طرح تنی ہوئی

دیکھا جو مجھ کو سامنے تو مُسکرا کے رہ گئی
سُرخی وہ اشتعال کی، حباب بن کے بہہ گئی

خالی مکان میں ایک رات

بادل سا جیسے اُڑتا ہو ایسی صدا سُنی
آواز دے کے چھُپ گیا اک سایہ سا کوئی
جب لالٹین بجھ گئی کوئی ہوا نہ تھی
سردی تھی کچھ عجیب سی، ٹھنڈے مزار سی
بیمار سی مہک تھی کسی خشک ہار کی
پھُوٹی کرن کہیں سے نگاہوں کے زہر کی
باہر گلی میں چُپ تھی کسی اُجڑے شہر کی

آدھی رات کا شہر

شہر سارا سو چکا ہو اُس گھڑی دیکھو اُسے
نیند میں گم ہو چکا ہو اُس گھڑی دیکھو اُسے

اُونچی اُونچی کھڑکیوں میں دھیمی دھیمی روشنی
چور بن کر چھپ گئی ہے ہر مکاں میں تیرگی

حُسن وحشی ہو چلا ہو اُس گھڑی دیکھو اُسے
سانپ زہری ہو چلا ہو اُس گھڑی دیکھو اُسے

ایک خوش باش لڑکی

کبھی چور آنکھوں سے دیکھ لیا
کبھی بے دھیانی کا زہر دیا

کبھی ہونٹوں سے سرگوشی کی
کبھی چال چلی خاموشی کی

جب جانے لگے تو روک لیا
جب بڑھنے لگے تو ٹوک دیا

اور جب بھی کوئی سوال کیا
اُس نے ہنس کر ہی ٹال دیا

ذرّوں کا ملاپ

جب نین بھی ہُوئے نشیلے
کچُھ بول بھی ہُوئے سُریلے
اور ہونٹ بہت زہریلے

اُن سے کہا نہ گیا
ہم سے رہا نہ گیا

بجلی لرز گئی
بدلی برس گئی

وعدہ خلافی

آنا تھا اُس کو پر نہیں آئی
یہ بھی عجب ہی بات ہُوئی

اسی سوچ میں شام ڈھلی
اور دھیرے دھیرے رات ہُوئی

جانے اب وہ کہاں پہ ہو گی
عنبر کی مہکار لیے

بیٹھے رہ گئے ہم تو یونہی
پھُولوں کے کچھ ھار لیے

ع۔ا کے لیے

آنکھیں کھول کے سُن ری گوری
مَیں ہوں وہ آواز
دن کا سُورج ڈوب گیا تو
بنے گی گہرا راز
جتنا وقت ملا ہے تجھ کو
اُس کو کام میں لا
مجُھ کو کھو دینے سے پہلے
مِیرے سامنے آ
رو رو کر پھر ہاتھ ملے گی
جب دن بیت گیا

جُدائی

مُڑ کر دیکھا تو انجم تھی

حیراں آنکھوں والی انجم
بڑی بڑی آنکھوں کو کھولے
مجھ کو ایسے دیکھ رہی تھی
جاتی رُت کا پھول ہوں جیسے
یا آوارہ جھونکا
جو بنتا ہے درد دلوں کا
یا آنسو آنکھوں کا

خود کلامی

مر بھی جاؤں تو مت رونا
اپنا ساتھ نہ چھوٹے گا

تیری میری چاہ کا بندھن
موت سے بھی نہیں ٹوٹے گا

میں بادل کا بھیس بدل کر
تجھ سے ملنے آؤں گا

تیرے گھر کی سونی چھت پر
غم کے پھول اُگاؤں گا

جب تو اکیلی بیٹھی ہو گی
تجھ کو خوب رلاؤں گا

ایک دفعہ

اِک دفعہ

وُہ مُجھ سے لپٹ کر

کِسی دُوسرے شخص کے غم میں

پُھوٹ پُھوٹ کر روئی تھی

وطن میں واپسی

کل وہ ملی جو بچپن میں میرے بھائی سے کھیلا کرتی تھی
جانے تب کیا بات تھی اُس میں مجھ سے بہت ہی ڈرتی تھی

پھر کیا ہوا؟ وہ کہاں گئی؟ اب کون یہ باتیں جانتا ہے
کب اتنی دُوری سے کوئی شکلوں کو پہچانتا ہے

لیکن اب جو ملی ہے مجھ سے ایسا کبھی نہ دیکھا تھا
اُس کو اتنی چاہ تھی میری، میں نے کبھی نہ سوچا تھا
نام بھی اُس نے بچے کا میرے ہی نام پہ رکھا تھا

پھر کہیں اس سے بچھڑ نہ جاؤں ایسے مجھ کو تکتی تھی
کوئی گہری بات تھی جی میں جسے وہ کہہ بھی نہ سکتی تھی

ایسی چپ اور پاگل آنکھیں دمک رہی تھیں شدت سے
میں تو سچ مچ ڈرنے لگا تھا اس خاموش محبت سے

بسنت رُت

کام دیو کی دھنش سے نکلے موہن تیکھے بان
سکھ ساگر کی لہریں آئیں چڑھتے چندر سمان

نگر نگر میں چھڑا ہُوا ہے مدھر ملن کا راگ
سدا سہاگن چنچل ناریں ہنس ہنس کھیلیں پھاگ

سر دہواہیں کھلی ہُوئی ہے ہرے رنگ کی گھاس
کُنج کُنج میں جاگ رہی ہے پیلے پھُول کی باس
پھر بھی لاکھوں سندریوں کا کومل من ہے اُداس

مدھر ملن

گھر کی منڈیروں پر گھر آئی کالی گھور گھٹا
بوندوں کی رم جھم میں سارے شہر کا شور مٹا
بجلی نے نیلے پربت کو لہو لہان کیا

چھت پر پازیبوں کے سُر کا اُجلا پھُول کھِلا
بندیا کے رنگوں میں دُکھ کا ساگر ڈُوب گیا
لاج کی خوشبُو کا سندیسہ چاروں اور بڑھا

بجلی نے نیلے پربت کو لہو لہان کیا

پرنگیا

کیسے میٹھے بول سُنے ہیں پھر بھی میں خاموش رہا ہُوں
اپنے ہی غم کے نشّے کی تالوں سے مدہوش رہا ہُوں

آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا جب اُس نے پرنام کیا تھا
اُس کی اُس اندھی پوجا کا مَیں نے یہ انعام دیا تھا

چلی گئی تو میں نے دل کو یہ کہہ کر سمجھایا تھا
وہ اک شام کا سایہ تھا جو مجھے ستانے آیا تھا

جو ہونا تھا ہو بھی چُکا ہے اب میں اور نہ درد سہوں گا
میں بھی اب سے شام کا سایہ بن کر اُس کے ساتھ رہوں گا

جاگو موہن پیارے

چھُپے گگن کی اوٹ میں اُس کے نینوں جیسے تارے
دُکھ کا سندیسہ لے کر آئے چاہت کے ہرکارے
آئی نہ ملنے رادھا رانی لاکھ جتن کر ہارے
رات گزر گئی سپنوں والی جاگو موہن پیارے

سارے رُوپ

ہنس ہنس پریت جتاتے دیکھا
جھوٹی قسمیں کھاتے بھی

اپنی چاہ میں روتے دیکھا
ناطہ توڑ کے جاتے بھی

گہری شام کی بجلی بن کر
پربت پر لہراتے بھی

ساون کی منہ زور ہوا میں
چھت کے دیئے جلاتے بھی

دُوری کا گیت

نیل گگن کا گہرا ساگر
تارے بہتے جاتے ہیں
اپنے اپنے دُکھ کی کہانی
مُجھ سے کہتے جاتے ہیں

ان کے جی کو روگ لگا ہے
چندر ماں کی دُوری کا
لیکن کِس سے ٹوٹ سکا ہے
بندھن اس مجبُوری کا

اسی اُداسی کے تیروں کو
دل پر سہتے جاتے ہیں
نیل گگن کا گہرا ساگر
تارے بہتے جاتے ہیں

راستے کی سوچ

شام تھی سونے پنگھٹ جیسی گھرے گھرے بادل تھے
اب تک مجھ کو یاد ہے جب میں چلا تھا چھپ کے مدھوبن سے

کتنی دیر لگائی مَیں نے بگڑے کام بنانے میں
بیت گئے ہیں کئی زمانے جا کر واپس آنے میں

کیسے اُس کے دل سے میں یہ گہری بات بھلاؤں گا
کیا منہ لے کر میں اپنی رادھا کے سامنے جاؤں گا

راستے کی تھکن

آس پاس کوئی گاؤں نہ دریا اور بدریا چھائی ہے
شام بھی جیسے کسی پرانے سوگ میں ڈوبی آئی ہے
پل پل بجلی چمک رہی ہے اور میلوں تنہائی ہے

کتنے جتن کیے ملنے کو پھر بھی کتنی دُوری ہے
چلتے چلتے ہار گیا میں پھر بھی راہ ادھوری ہے
گھائل ہے آواز ہوا کی اور دل کی مجبُوری ہے

جنگل میں زندگی

پُر اسرار بلاؤں والا
سارا جنگل دشمن ہے
شام کی بارش کی ٹپ ٹپ
اور میرے گھر کا آنگن ہے

ہاتھ میں اک ہتھیار نہیں ہے
باہر جاتے ڈرتا ہوں
رات کے بھوکے شیروں سے
بچنے کی کوشش کرتا ہوں

جنگل کا جادو

جس کے کالے سایوں میں ہے وحشی جنّتوں کی آبادی
اس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی اک شہزادی

اس کے پاس ہی ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے تھے
پیلے پیلے دانت نکالے نعش کی گردن چوم رہے تھے

ایک بڑے سے پیڑ کے اوپر کچھ گدھ بیٹھے اونگھ رہے تھے
سانپوں جیسی آنکھیں میچے خون کی خوشبو سونگھ رہے تھے

سُندربَن میں ایک رات

رات تھی گہرے راز سی
چھپی ہُوئی آواز سی
ہیں بھی رستہ بھُول کے
چھوڑ کے ساتھی پھُول سے
دیکھ کے بڑھتی رات کو
سر پہ چڑھتی رات کو
ڈر کر دھوکا کھا گیا
اس جنگل میں آ گیا
یہاں عجب ہی حال تھا
بن تھا گہرے جال سا
سبز کے اندر لال سا
پیڑ تھے کچھ نمناک سے
گُم سُم اور غمناک سے
اُونچے ہیبت ناک سے
اُوپر چاند کی روشنی
نیچے گہری تیرگی
شیر دھاڑا دیر تک
جنگل گونجا دیر تک

اُداس کرنے والی آواز

آدھی رات اور ایسا موسم
ساری دنیا سوتی ہے

دُور سے آتی تیز ہوا
خوشبُو کے ہار پروتی ہے

چھُپ کر دیکھوں کون ہے یہ
جو پھُوٹ پھُوٹ کر روتی ہے

سفر سے روکنے والی آواز

"ٹھہر جانا — ٹھہر جانا —"
بلاتی ہے ارے ناداں
تجھے آواز گھائل سی

سنبھل جانا — نہ رُک جانا
صدا ہے یہ ارے ناداں
ہوا میں اُڑتے بادل کی

ویران درگاہ میں آواز

اک بڑی درگاہ تھی اور ڈھلکی ڈھلکی چاندنی
مسکراہٹ جیسے پیلے آدمی کی نعش کی

چلتے چلتے میں نے کوئی سرسراہٹ سی سُنی
ہولے ہولے پاس آتی ایک آہٹ سی سُنی

دُور تک کچھ بھی نہ تھا معبد کے سائے کے سوا
میری اپنی چاپ ہی سے میرا دل ڈرنے لگا

خوف سے گھبرا کے میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی
اُف خُدا ! یہ سانس جیسے اک قیامت بن گئی

دیر تک جیسے سفر کرتی ہے گنبد کی صدا
تھا اثر ایسا ہی کچھ اس میری آہِ سرد کا

صحن سارا سہمی سہمی آہٹوں سے بھر گیا
بڑھ رہا ہو چھپ کے جیسے دشمنوں کا قافلہ

”کون ہے؟“

"کون ہے؟" میں اک عجب موجودگی سے ڈر گیا
جیسے کوئی تھا وہاں پر، پھر بھی وہ روپوش تھا

"کون ہے؟ — کون ہے؟ — کون ہے؟"
یوں جواب آتا رہا جیسے کوئی بے چین ہے

"کیا یہاں کوئی نہیں ہے؟"
میں نے پھر ڈر کر کہا

"کوئی ہے — کوئی نہیں ہے
کوئی ہے — کوئی نہیں ہے"
دیر تک ہوتا رہا

ایک اَور خواہش

خواہشیں ہیں دل میں اِتنی جتنے اِس دُنیا میں غم

شوق سے جلتی جبینیں اور جادو کے صنم
مہرباں سرگوشیاں ، نامہربانی کے ستم
آنکھ کے پُر پیچ رستے ، ریشمی زلفوں کے خم

اصل میں کیا ہے یہ سب ؟ کچھ بھی پتہ چلتا نہیں
چاند جیسے آسماں کا جو کبھی ڈھلتا نہیں
شعلہ جیسے وہم کا ، بجھتا نہیں جلتا نہیں

لاکھ کوشش کر چکا ہُوں پھر بھی کچھ سمجھا نہیں
لاکھ شکلیں دیکھ لی ہیں پھر بھی کچھ دیکھا نہیں

گر خبر مل جائے مجھ کو اِس نرالے راز کی
ٹوٹ جائے حد کہیں تخئیل کی پرواز کی

وجُود کی اہمیّت

تو ہے تو پھر میں بھی ہُوں
میں ہوں تو یہ سب کچھ ہے
دُکھ کی آگ بھی، موت کا غم بھی
دل کا درد اور آنکھ کا نم بھی

میں جو نہ ہوتا
میری طرح پھر کون
جہاں کے
اتنے غموں کا بوجھ اُٹھاتا
دوزخ کے شعلوں میں جل کر
شعروں کے گلزارِ کھلاتا

فنا اور بقا

ابھی ان گنت دل رُبا صورتیں ہیں
جو مٹی کے ذروں، ہوا کے جھکڑوں، فلک کے ستاروں، گُلوں کے تعطّر
میں پوشیدہ و نادمیدہ پڑی ہیں
کبھی شام آئے گی
جب ہر جگہ ان کی باتوں کی بجتی ہُوئی گھنٹیوں کے مدھر شور کی لَے سے بھر جائے گی
ہر گلی ان کے نازک دبے پاؤں چلنے کی آہٹ کے جادو میں کھو جائے گی
ہر بچھی سیج ان کے تنفّس کی جلتی ہُوئی خوشبوؤں سے مہک جائے گی
پھر اسی طرح جیسے تم اب میرے پہلو میں چپ بیٹھی شرما رہی ہو
کبھی رات آئے گی
جب وہ بھی سولہ سنگاروں سے سج کر
کسی پریمی کی میٹھی سنگت میں بیٹھی
خود اپنی ہی سوچوں سے شرمائیں گی

جبر کا اختیار

تاج پہن کر شاہ بنوں یا گلیوں کا راہگیر
دریا بنوں اور جلوں ہوا میں یا زہریلا تیر

میرے بس میں ہے اب سب کچھ، موت ہے مری اسیر
آسمان میرے پاؤں تلے ہے، مٹھی میں تقدیر

مجھ کو گھائل کر نہیں سکتی چاہت کی شمشیر
کتنے جتن سے توڑی میں نے خواہش کی زنجیر

مَیں اور میرا خُدا

لاکھوں شکلوں کے میلے میں تنہا رہنا میرا کام
بھیس بدل کر دیکھتے رہنا تیز ہواؤں کا کہرام
ایک طرف آواز کا سورج، ایک طرف اک گونگی شام
ایک طرف جسموں کی خوشبو، ایک طرف اس کا انجام
بن گیا قاتل میرے لیے تو اپنی ہی نظروں کا دام
سب سے بڑا ہے نام خدا کا اس کے بعد ہے میرا نام

مَیں اور میرا سایہ

اک دفعہ میں آگے بھاگا
اور وہ میرے پیچھے
اک دفعہ وہ آگے آگے
اور میں اُس کے پیچھے

مذہبی کہانیوں کا درخت

درخت مستی میں جھومتا ہے
اسے نہ چھیڑو ، اسے نہ چھیڑو
اسے بس اپنے اکیلے پن میں
اداس رہنے دو ، جھومنے دو
ہمیشہ اک جیسے رات دن کے
اُجاڑ مدفن میں گھومنے دو

کبھی نہ اس کے قریب جانا
کہ اس کا پھل موت ہے ہمیشہ
اسے بس اپنے اکیلے پن میں
اداس رہنے دو ، جھومنے دو
ہمیشہ اک جیسے رات دن کے
اُجاڑ مدفن میں گھومنے دو

وجود کی حقیقت

جلتا ہے بدن سارا ، بھڑکا ہے لہو میرا
لبریز ہے شعلوں کی سُرخی سے سبو میرا

اک سانپ مرے تن سے لپٹا ہے محبت سے
مجبُور ہے لیکن وہ زہریلی طبیعت سے

پھنکار کے ہونٹوں پر ڈستا ہے وہ جب مجھ کو
لگتا ہے عجب اس کی آنکھوں کا غضب مجھ کو
اور زہر دکھاتا ہے اک خوابِ طرب مجھ کو

آتی ہے سزا بن کے یاد اپنی حقیقت کی
خواہش کے جہنم میں اک چیخ مسرت کی

ایک باغی بیٹے کی تصویر

باپ مرتا جا رہا تھا ، ماں بہت دلگیر تھی
چپ تھی بس جیسے وہ کوئی خواب کی تصویر تھی

ہر طرف پیڑوں کے سایے ، شام تھی تنہا بہت
اور بیٹا باپ کے اس حال پر رویا بہت

دیکھ کر اک دوسرے کو کوئی بھی بولا نہیں
کیا تھا ان کے سخت دل میں ، راز یہ کھولا نہیں

دل دُکھی تھے ، نظریں گہرے غم نصیبوں کی طرح
پھر بھی دونوں لگ رہے تھے دو رقیبوں کی طرح

میرے دشمن کی موت

تیغ لہو میں ڈوبی تھی اور پیڑ خوشی سے جھوما تھا
بادِ بہاری چلی جھوم کے جب اُس نے مجھے دیکھا تھا
گھائل نظریں اُس دشمن کی ایسے مجھ کو تکتی تھیں
جیسے انہونی کوئی دیکھی ان کمزور نگاہوں نے

یہ انصاف تو بعد میں ہوگا، کیا جھوٹا کیا سچا ہے
کون یقین سے کہہ سکتا ہے، کون بُرا کون اچھا ہے
لیکن پھر بھی ایک بار تو میرا دل بھی کانپا تھا
کاش یہ سب کچھ کبھی نہ ہوتا میں نے دکھ سے سوچا تھا
گھائل نظریں اُس دشمن کی گہری سوچ میں کھوئی تھیں
جیسے انہونی کوئی دیکھی ان کمزور نگاہوں نے

کون ہُوں میں اور کون تھا وہ جس پہ ہونی نے وار کیا
کون تھا وہ جس شخص کو میں نے بھری بہار میں مار دیا

○

ڈوبا نڈھال سُورج ، تاروں کا باغ چمکا
پیڑوں کی چوٹیوں پر مہ کا چراغ چمکا

گزرے دنوں کی لَو سے میرا دماغ چمکا
گم گشتہ عشرتوں کی رہ کا سراغ چمکا

جاگی ہر اک گلی میں عطرِ حنا کی خوشبُو
اِس نکہتِ رواں میں ہر دل کا داغ چمکا

بہنے لگی ہے ندی اک سرخ رنگ مے کی
اک شوخ کے لبوں کا لعلیں ایاغ چمکا

○

وقت سے کہیو ذرا کم کم چلے
کون یاد آیا ہے آنسو تھم چلے

دم بخود کیوں ہے خزاں کی سلطنت
کوئی جھونکا، کوئی موجِ غم چلے

چار سُو باجیں پلوں کی پائلیں
اس طرح رقاصۂ عالم چلے

دیر کیا ہے آنے والے موسمو
دن گزرتے جا رہے ہیں، ہم چلے

کس کو فکرِ گنبدِ قصرِ حباب
آبجو ہیہم چلے، بہم چلے

○

شام آئی ہے شرابِ تیز پینا چاہیے
ہو چکی ہے دیر اب زخموں کو سینا چاہیے

مر گئے تو پھر کہاں یہ حُسنِ زارِ زندگی
زخمِ دل گہرا بہت ہے پھر بھی جینا چاہیے

آج وہ کس دھج سے سیرِ گلستاں میں محو ہے
چُھپ کے اُس کے ہاتھ سے وہ پھول چھینا چاہیے

ابر ہو چھایا ہُوا اور باغ ہو مہکا ہُوا
گود میں گلفام ہو اور پاس مینا چاہیے

جا بجا میلے لگے ہیں لال ہونٹوں کے منیر
تیرگی میں دیکھنے کو چشمِ بینا چاہیے

○

بادِ بہارِ غم میں وہ آرام بھی نہ تھا
وہ شوخ آج شامِ لبِ بام بھی نہ تھا

دردِ فراق ہی میں کٹی ساری زندگی
گرچہ ترا وصال بڑا کام بھی نہ تھا

رستے میں ایک بھُولی ہُوئی شکل دیکھ کر
آواز دی تو لب پہ کوئی نام بھی نہ تھا

کیوں دشتِ غم میں خاک اُڑاتا رہا منیؔر
میں جو قتیلِ حسرتِ ناکام بھی نہ تھا

○

اپنا تو یہ کام ہے بھائی، دل کا خون بہاتے رہنا
جاگ جاگ کر ان راتوں میں شعر کی آگ جلاتے رہنا

اپنے گھروں سے دور بنوں میں پھرتے ہوئے آوارہ لوگو
کبھی کبھی جب وقت ملے تو اپنے گھر بھی جاتے رہنا

رات کے دشت میں پھول کھلے ہیں بھولی بسری یادوں کے
غم کی تیز شراب سے ان کے تیکھے نقش مٹاتے رہنا

خوشبو کی دیوار کے پیچھے کیسے کیسے رنگ جمے ہیں
جب تک دن کا سورج آئے اس کا کھوج لگاتے رہنا

تم بھی منیرؔ اب ان گلیوں سے اپنے آپ کو دور ہی رکھنا
اچھا ہے جھوٹے لوگوں سے اپنا آپ بچاتے رہنا

○

جب بھی گھر کی چھت پر جائیں ناز دکھانے آجاتے ہیں
کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آجاتے ہیں

دن بھر جو سُورج کے ڈر سے گلیوں میں چھپ رہتے ہیں
شام آتے ہی آنکھوں میں وہ رنگ پرانے آجاتے ہیں

جن لوگوں نے ان کی طلب میں صحراؤں کی دھول اُڑائی
اب یہ حسیں ان کی قبروں پر پھول چڑھانے آجاتے ہیں

کون سا وہ جادو ہے جس سے غم کی اندھیری، سرد گپھا میں
لاکھ نسائی سانس دلوں کے روگ مٹانے آجاتے ہیں

زر کے ریشمیں رومالوں کو کس کس کی نظروں سے چھپائیں
کیسے ہیں وہ لوگ جنہیں یہ راز چھپانے آجاتے ہیں

ہم بھی منیرؔ اب دنیا داری کر کے وقت گزاریں گے
ہوتے ہوتے جینے کے بھی لاکھ بہانے آجاتے ہیں

○

گھپ اندھیرے میں چھپے سُونے بنوں کی اور سے
گیت برکھا کے سنو رنگوں میں ڈوبے مور سے

شام ہوتے ہی دلوں کی بے کلی بڑھنے لگی
ڈر رہی ہیں گوریاں چلتی ہوا کے زور سے

رات کے سنسان گنبد میں رچی ہے راس سی
پہرے داروں کی صداؤں کے طلسمی شور سے

لاکھو پلکوں کو جھکاؤ، لاکھ گھونگھٹ میں چھپو
سامنا ہو کر رہے گا دل کے موہن چور سے

بھاگ کر جائیں کہاں اس دیس سے اب اے منیر
دل بندھا ہے پریم کی سُندر، سجیلی ڈور سے

○

"اپنے گھر کو واپس جاؤ" رو رو کر سمجھاتا ہے
جہاں بھی جاؤں میرا سایہ پیچھے پیچھے آتا ہے

اس کو بھی تو جا کر دیکھو، اس کا حال بھی مجھ سا ہے
چُپ چُپ رہ کر دُکھ سہنے سے تو انساں مر جاتا ہے

مجھ سے محبت بھی ہے اس کو لیکن یہ دستور ہے اس کا
غیر سے ملتا ہے ہنس ہنس کر مجھ سے ہی شرماتا ہے

کتنے یار ہیں پھر بھی منیرؔ اس آبادی میں اکیلا ہے
اپنے ہی غم کے نشّے سے اپنا جی بہلاتا ہے

○

جو دیکھے تجھے جادو ترے ہات کے
ہیں چرچے ابھی تک اسی بات کے

گھٹا دیکھ کر خوش ہوئیں لڑکیاں
چھتوں پر کھلے پھول برسات کے

مجھے درد دل کا وہاں لے گیا
جہاں دَر کھلے تھے طلسمات کے

ہوا جب چلی پھڑ پھڑا کر اُڑے
پرندے پرانے محلّات کے

نہ تُو ہے کہیں اور نہ میں ہوں کہیں
یہ سب سلسلے ہیں خیالات کے

منیرؔ آ رہی ہے گھڑی وصل کی
زمانے گئے ہجر کی رات کے

○

پھول تھے، بادل بھی تھا اور وہ حسیں صورت بھی تھی
دل میں لیکن اور ہی اک شکل کی حسرت بھی تھی

جو ہوا میں گھر بنائے کاش کوئی دیکھتا
دشت میں رہتے تھے پر تعمیر کی عادت بھی تھی

کہہ گیا میں سامنے اس کے جو دل کا مدّعا
کچھ تو موسم بھی عجب تھا، کچھ مری ہمّت بھی تھی

اجنبی شہروں میں رہتے عمر ساری کٹ گئی
گو ذرا سے فاصلے پر گھر کی ہر راحت بھی تھی

کیا قیامت ہے منیرؔ اب یاد بھی آتے نہیں
وہ پرانے آشنا، جن سے ہمیں اُلفت بھی تھی

○

تجھ سے بچھڑ کر کیا ہوں میں، اب باہر آ کر دیکھ
ہمت ہے تو میری حالت آنکھ ملا کر دیکھ

شام ہے گہری، تیز ہوا ہے، سر پہ کھڑی ہے رات
رستہ گئے مسافر کا اب دِیا جلا کر دیکھ

دروازے کے پاس آ آ کر واپس مُڑتی چاپ
کون ہے اس سُنسان گلی میں، پاس بُلا کر دیکھ

شاید کوئی دیکھنے والا ہو جائے حیران
کمرے کی دیواروں پر کوئی نقش بنا کر دیکھ

تُو بھی منیر اب بھرے جہاں میں مل کر رہنا سیکھ
باہر سے تو دیکھ لیا اب اندر جا کر دیکھ

○

پی لی تو کچھ پتہ نہ چلا وہ سرور تھا
وہ اس کا سایہ تھا کہ وہی رشکِ حور تھا

کل میں نے اس کو دیکھا تو دیکھا نہیں گیا
مجھ سے بچھڑ کے وہ بھی بہت غم سے چور تھا

رویا تھا کون کون مجھے کچھ خبر نہیں
میں اس گھڑی وطن سے کئی میل دور تھا

شامِ فراق آئی تو دل ڈوبنے لگا
ہم کو بھی اپنے آپ پہ کتنا غرور تھا

چہرہ تھا یا صدا تھی کسی بھولی یاد کی
آنکھیں تھیں اس کی یارو کہ دریائے نور تھا

نکلا جو چاند، آئی مہک تیز سی منیر
میرے سوا بھی باغ میں کوئی ضرور تھا

○

عجب رنگ رنگیں قباؤں میں تھے
دل و جان جیسے بلاؤں میں تھے

طلسمات ہونٹوں پہ ، آنکھوں میں غم
نئے زیورات اُن کے پاؤں میں تھے

مہک تھی ترے پیرہن کی کہیں
گُلستاں سے شب کی ہواؤں میں تھے

ذرا پی کے دیکھا جو چاروں طرف
مکان و مکیں سب خلاؤں میں تھے

یہ شعلے جو سڑکوں پہ پھرتے ہیں اب
پہاڑوں کی کالی گپھاؤں میں تھے

اگر روک لیتے تو جاتا نہ وہ
مگر ہم بھی اپنی ہواؤں میں تھے

کلی بکس جیسے کھلا تھا منیر
کچھ ایسے ہی منظر فضاؤں میں تھے

○

اپنی ہی تیغِ ادا سے آپ گھائل ہو گیا
چاند نے پانی میں دیکھا اور پاگل ہو گیا

وہ ہوا تھی شام ہی سے رستے خالی ہو گئے
وہ گھٹا برسی کہ سارا شہر جل تھل ہو گیا

میں اکیلا اور سفر کی شام رنگوں میں ڈھلی
پھر یہ منظر میری نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا

اب کہاں ہو گا وہ اور ہو گا بھی تو ویسا کہاں
سوچ کر یہ بات جی کچھ اور بوجھل ہو گیا

حُسن کی دہشت عجب تھی وصل کی شب میں منیرؔ
ہاتھ جیسے انتہائے شوق سے شل ہو گیا

○

بادل برس رہا تھا وہ جب میہماں ہوا
کل شام تو وہ مجھ پہ عجب مہرباں ہوا

شاخِ گلِ انار کھِلی بھی تو سنگ میں
وہ دل ترا ہوا یا لبِ خونفشاں ہوا

مرغِ سحر کی تیز صدا پچھلی رات کو
ایسی تھی جیسے کوئی سفر پر رواں ہوا

ٹھنڈی ہوا چلی تو جلیں مشعلیں ہزار
جو غم نظر میں چمکا تھا اب کہکشاں ہوا

مَے بھی حریفِ دردِ تمنا نہیں ہوئی
اپنے ہی غم کے نشے سے میں سرگراں ہوا

زردی تھی رُخ پہ ایسی کہ میں ڈر گیا منیرؔ
کیا عطر تھا کہ صرف قبائے خزاں ہوا

○

بیٹھ جاتا ہے وہ جب محفل میں آ کے سامنے
میں ہی بس ہوتا ہوں اُس کی اِس ادا کے سامنے

تیز تھی اتنی کہ سارا شہر سُونا کر گئی!
دیر تک بیٹھا رہا میں اُس ہوا کے سامنے

رات اِک اُجڑے مکاں پر جا کے جب آواز دی
گونج اُٹھے بام و دَر میری صدا کے سامنے

وہ رنگیلا ہاتھ میرے دل پہ اور اس کی مہک
شمعِ دل بُجھ سی گئی رنگِ حنا کے سامنے

مَیں تو اُس کو دیکھتے ہی جیسے پتّھر ہو گیا
بات تک منہ سے نہ نکلی بے وفا کے سامنے

یاد بھی ہیں اے منیر اس شام کی تنہائیاں
ایک میداں، اک درخت اور تو خُدا کے سامنے

○

غم کی بارش نے بھی تیرے نقش کو دھویا نہیں
تُو نے مجھ کو کھو دیا، میں نے تجھے کھویا نہیں

نیند کا ہلکا گلابی سا خمار آنکھوں میں تھا
یوں لگا جیسے وہ شب کو دیر تک سویا نہیں

ہر طرف دیوار و در اور ان میں آنکھوں کے ہجوم
کہہ سکے جو دل کی حالت وہ لبِ گویا نہیں

جُرم آدم نے کیا اور نسلِ آدم کو سزا
کاٹتا ہوں زندگی بھر مَیں نے جو بویا نہیں

جانتا ہوں ایک ایسے شخص کو مَیں بھی منیرؔ
غم سے پتّھر ہو گیا لیکن کبھی رویا نہیں

○

شبِ ماہتاب نے شہ نشیں پہ عجیب گُل سا کھِلا دیا
مجھے یوں لگا کسی ہاتھ نے مرے دل پہ تیر چلا دیا

کوئی ایسی بات ضرور تھی شبِ وعدہ وہ جو نہ آ سکا
کوئی اپنا وہم تھا درمیاں یا گھٹا نے اُس کو ڈرا دیا

یہی آن تھی مری زندگی، لگی آگ دل میں تو اُف نہ کی
جو جہاں میں کوئی نہ کر سکا وہ کمال کر کے دکھا دیا

یہ جو لال رنگ پتنگ کا سرِ آسماں ہے اُڑا ہُوا
یہ چراغ دستِ حنا کا ہے جو ہوا میں اُس نے جلا دیا

مرے پاس ایسا طلسم ہے جو کئی زمانوں کا اسم ہے
اُسے جب بھی سوچا بُلا لیا، اُسے جو بھی چاہا بنا دیا

○

آئینہ بن کر کبھی اُن کو بھی حیراں دیکھیے
اپنے غم کو اُن کی صورت سے نمایاں دیکھیے

اس دیارِ چشم و لب میں دل کی یہ تنہائیاں
ان بھرے شہروں میں بھی شامِ غریباں دیکھیے

عمر گزری دل کے بجھنے کا تماشا کر چکے
کس نظر سے بام و در کا یہ چراغاں دیکھیے

دیکھیے اب کے برس کیا گُل کھلاتی ہے بہار
کتنی شدّت سے مہکتا ہے گلستاں دیکھیے

اے منیر اس انجمن میں چشمِ لیلیٰ کا خیال
سردیوں کی بارشوں میں برق لرزاں دیکھیے

ہنسی چھپا بھی گیا اور نظر ملا بھی گیا
یہ اک جھلک کا تماشا جگر جلا بھی گیا

اُٹھا تو جا بھی چکا تھا، عجیب مہماں تھا
صدائیں دے کے مجھے نیند سے جگا بھی گیا

غضب ہُوا جو اندھیرے میں جل اُٹھی بجلی
بدن کسی کا طلسمات کچھ دکھا بھی گیا

نہ آیا کوئی لبِ بام، شام ڈھلنے لگی
وفورِ شوق سے آنکھوں میں خُون آ بھی گیا

ہوا تھی، گہری گھٹا تھی، حنا کی خوشبو تھی
یہ ایک رات کا قصہ لہو رُلا بھی گیا

چلو منیر چلیں، اب یہاں رہیں بھی تو کیا
وہ سنگ دل تو یہاں سے کہیں چلا بھی گیا

○

دل جل رہا تھا غم سے مگر نغمہ گر رہا
جب تک رہا میں ساتھ مرے یہ ہنر رہا

صبحِ سفر کی رات تھی، تارے تھے اور ہوا
سایہ سا ایک دیر تلک بام پر رہا

میری صدا ہوا میں بہت دُور تک گئی
پر میں بُلا رہا تھا جسے، بے خبر رہا

گزری ہے کیا مزے سے خیالوں میں زندگی
دُوری کا یہ طلسم بڑا کارگر رہا

خوف آسماں کے ساتھ تھا سر پر جھکا ہوا
کوئی ہے بھی یا نہیں ہے، یہی دل میں ڈر رہا

اُس آخری نظر میں عجب درد تھا منیرؔ
جانے کا اس کے رنج مجھے عمر بھر رہا

گیت

چاروں کھونٹ مرلیا باجے، دُھن موہن، متواری

جمنا تٹ پر آن براجے سانورے شیام مراری
چاروں کھونٹ مرلیا باجے، دُھن موہن، متواری
جس کو سُن کر سوچ میں کھو گئی برندا بن کی ناری

چاروں کھونٹ مرلیا باجے، دُھن موہن، متواری

جنم جنم سے یہی مرلیا موہ کا گیت سُنائے
برندا بن کی ناری کو جمنا کے تٹ پہ بُلائے
کیسے کوئی لاج کے بندھن توڑ کے پریت نبھائے
گرج گرج کے جی کو جلاتی آئی بدریا کاری

اے صاحبِ جمال
اب آکے دیکھ تیرے لیے کیا ہے میرا حال
اے صاحبِ جمال

کچھ رحم کر نہ اتنے تغافل سے کام لے
آ اور مسکرا کے مرا ہاتھ تھام لے
تیرے بغیر مجھ کو تو جینا ہُوا محال
اے صاحبِ جمال

دُنیا سے دُور، اس کی بھری محفلوں سے دُور
چوکھٹ پہ تیری آکے گرا ہوں غموں سے چُور
پردہ اُٹھا کے سُن بھی ذرا اب مرا سوال
اے صاحبِ جمال

نیلے نیلے آسمان پر بادل ہیں چمکیلے
جانے کیا دیکھا گوری نے ہو گئے نین نشیلے

نیلے نیلے آسمان پر......

سایہ بن کر دل سے گزری یاد گئی برساتوں کی
یا دیکھی تصویر نظر نے پیار میں ڈوبی راتوں کی

نیلے نیلے آسمان پر......

روشنیاں سی دمک رہی ہیں آج کسی نگاہوں میں
چلی ہوا دیوانی ہو کر، پھول برس گئے راہوں میں

نیلے نیلے آسمان پر......

اُڑی مہک کالے بالوں سے، جیسے دُور اندھیرے میں
پھلواڑی کوئی کھلی ہُوئی ہو دیواروں کے گھیرے میں

نیلے نیلے آسمان پر......

پُرانے گھر کا گیت

شام ہُوئی گھر آ باورے ، شام ہُوئی گھر آ
تُو نے سفر میں کیا کچھ دیکھا ہم کو بھی تو سنا، باورے
شام ہُوئی گھر آ

کیسے کیسے لوگ ملے تھے ، کیا تھا ان کا نام
کہاں کہاں کی خاک اُڑائی، کہاں کیا بسرام
کون تھا جس نے تیرے دل سے مجھ کو دیا بھُلا ، باورے
شام ہُوئی گھر آ

پچھلے پہر کا چاند تھا کتنا چُپ چُپ اور اُداس
اک سایہ خاموش کھڑا تھا دیواروں کے پاس
یاد ہے اُس نے تجھُ سے کہا تھا: "آج رات مت جا" باورے
شام ہُوئی گھر آ

گیت

کب تک چلتا رہے گا راہی ان انجانی راہوں میں
کب تک شمع جلے گی غم کی ان بے چین نگاہوں میں

وہ بھی بھول گیا ہوگا تجھے دُنیا کے جنجالوں میں
کتنا بدل گیا ہے تُو بھی آتے جاتے سالوں میں
گا کوئی گیت خوشی کا پاگل کیا رکھا ہے آہوں میں

مل بھی گیا وہ، پھر کیا ہوگا؟ لاکھوں ملتے دیکھے ہیں
یہ گُلزار تو رات کی چُپ میں سب نے کھِلتے دیکھے ہیں
رات کٹی تو خاک اُڑتی ہے پیار کی جلوہ گاہوں میں
کب تک .....

گیت

کس کو ڈھونڈنے گھر سے نکلی — اے راتوں کی ہوا
کہاں ہیں تیرے من کے موہن — کچھ تو بھید بتا
اے راتوں کی ہوا

اسکی کھوج میں چلتے چلتے تھکیں گے تیرے پاؤں
پھر بھی دُور رہے گا تجھ سے اس پریتم کا گاؤں
چھوڑ یہ دُکھ کا کھیل بانوری — گھر کو واپس جا
اے راتوں کی ہوا

پربت کے نیلے جھرنوں کو اپنے گیت سُنا
اُونچے اُونچے پیڑوں والے بن کی ہنسی اُڑا
اے راتوں کی ہوا

گیت

شام کا تارا چمکے ایسے
جیسے مست رسیلے نین
جب میں بکھری آوازوں کے سُونے بَن سے گزر کر
ڈری ہُوئی آنکھوں میں گہرے غم کے خزانے بھر کر
سُنتا جاؤں ڈگر ڈگر پر تیز ہوا کے گھائل بین
شام کا تارا چمکے ایسے
جیسے مست رسیلے نین

کس منزل کا راہی ہوں میں، کوئی نہ اس کو جانے
کیسا درد ہے دل میں میرے، کون اسے پہچانے
کھڑی ہُوئی ہے سر پہ دُکھ کی لمبی، کالی رین
شام کا تارا چمکے ایسے

او متوالی نار
چھوڑ کے سب سنسار
جا موہن کے دوار ـــــ او متوالی نار

دیکھ گھٹا گھنگھور
سُن ہردے کا شور
کر سولہ سنگھار ـــــ او متوالی نار

پھر آئے گی رین
کرے گی من بے چین
پیاسے رہیں گے نین
پڑے گی دُکھ کی پھوار ـــــ او متوالی نار

گیت

شور کرتے، گونجتے، گھنگھور کالے بادلو
لاؤ اس بھولے سمے کی دل جلاتی شام کو
شور کرتے، گونجتے، گھنگھور کالے بادلو

ہونٹ جلتے دیپ، آنکھیں رنگ کی پچکاریاں
اپنے اپنے دھیان میں ڈوبی سجیلی ناریاں
اس رسیلی راس کو بس دور سے تکتے رہو
شور کرتے، گونجتے، گھنگھور کالے بادلو

بانسری کی دُھن کہیں سُونے بنوں میں کھو گئی
رادھیکا موہن کا رستہ تکتے تکتے سو گئی
ڈھونڈ کر لاؤ کہیں سے اس سلونے شیام کو
شور کرتے، گونجتے، گھنگھور کالے بادلو

گیت

جس نے مرے دل کو درد دیا
اُس شکل کو میں نے بھلایا نہیں

اک رات کسی برکھا رُت کی
کبھی دل سے ہمارے مٹ نہ سکی
بادل میں جو چاہ کا پھُول کھِلا
وہ دھوپ میں بھی کمہلایا نہیں

جس نے مرے دل کو درد دیا
اُس شکل کو میں نے بھلایا نہیں

گجرے سے سجی پیاسی آنکھیں
ہر دوار سے درشن کو جھانکیں
پر جس کو ڈھونڈتے ہیں ہارا
اُس روپ نے درس دکھایا نہیں

جس نے مرے دل کو درد دیا
اُس شکل کو میں نے بھلایا نہیں

ہر راہ پہ سُندر نار کھڑی
چاہت کے گیت سناتی رہی
جس کے کارن ہیں کوی بنا
وہ گیت کسی نے سنایا نہیں
جس نے مرے دل کو درد دیا
اُس شکل کو میں نے بھلایا نہیں

دشمنوں کے درمیان شام

منیر نیازی

انتساب

امام حسین علیہ السلام کے نام

ترتیب

غزلیں

تعارف

ایسا لگتا ہے کہ ہم سب ایک مہیب جھٹپٹے کی دھند، خاموشی اور لجاجت میں گھرے ہوئے اپنا راستہ پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں پتہ نہیں کہ مشرق کدھر ہے اور مغرب کدھر، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ جھٹپٹا صبح کا ہے یا شام کا، تھوڑی دیر بعد نیا دن ہمارے لیے نئے عزائم اور صعوبتیں لے کر آئے گا یا رات کسی عذاب کی طرح ہم پہ نازل ہو گی ——— سیاہ رات جس میں ہم شاید رستوں کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کی سرحدوں کو بھی بھول جائیں گے، کون جانے؟

تذبذب کی اس فضا میں ہر منزل، گرد و پیش کا سارا منظر، غرضیکہ زمین اور آسمان نا دیدہ اور نامعلوم خطروں سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے آدمیوں کی، دھند میں مٹی مٹی شکلیں اتنی پر اسرار اور غیر حقیقی ہیں کہ ان سے خوف آتا ہے اور دشمنی کی بو۔

"آجکل ہر آدمی دوسرے کو ایک خطرہ سمجھتا ہے۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے۔ لیکن آدمی جتنا زیادہ ذہنی اور مثالیت پسند ہو گا، اتنا ہی زیادہ دوسرے کی جسمانی موجودگی کو ایک خطرہ سمجھے گا جو گویا اس کی جان کے درپے ہے۔"

بات یہ کسی گیانی نے کہی ہے، نام اس کا لینے سے کیا حاصل! یہی اس صدی کی کڑوی سچائی ہے، اور یہی بچھڑے ہوئے تمدن کی سرد مہر، خونی شام ہے۔ یہ جھٹپٹا شام ہی کا ہو گا۔ جب آنکھ رکھنے والا ایک شاعر یہ کہتا ہے اور فضا میں پھیلی ہوئی دشمنی کی بُو اور تنہائی کی سائیں سائیں کو اپنی نظموں کے ذریعے مستقل وجود بخشتا جاتا ہے، تو اسے جھٹلانا مشکل ہے۔ بے شک، ہم پٹے ہوئے مہرے ہیں۔ شام کو دم گھونٹنے والے، چلائے خانوں کی میزوں پر بیٹھے ہوئے دوست نما دشمن، بسوں میں ایک دوسرے کی جگہ چھیننے پر تلے ہوئے مسافر، دفتر سے لوٹ کر بیوی بچوں پر برسنے والے محرر، فلک سے چمٹے ہوئے حریص، توندل بیوپاری اور شام کی لال کرنوں یا شام کے فوراً بعد نیلی پیلی نیون روشنیوں میں لتھڑے ہوئے بے کیف چہرے بابل اور نینوا کی شام! غداری اور دشمنی کی شام!

لیکن ہمارے دلوں کو ڈھارس دینے اور خود اپنے ذہن کو اجالنے کی خاطر، تضاد کو نمایاں کرنے کے لیے، منیر ہمیں اس صبح کی جھلکیاں بھی دکھاتا رہتا ہے۔ جو ہمارا بچپن تھی، جب رنگ زندہ، ہوا تازہ اور آنکھیں روشن تھیں، اور اس خوبصورتی اور صداقت کی جھلکیاں بھی، جو بڑھتی ہوئی کمینگی اور بے حسی کے باوجود اب بھی کہیں کہیں دلوں میں، چہروں پر، باتوں میں اور فطرت کے مظاہر میں باقی ہیں۔

میرا یقین ہے کہ جہاں جہاں بھی انسان کے قدم پہنچے ہیں، وہ اپنی خوشبو

اور آہٹ پیچھے چھوڑ گیا ہے ۔ یہی وہ ورثہ ہے جو فطرت کو انسان سے ملا ہے ، ایک اُداس کرنے والی خوشبو جو کھنڈروں ، پرانی جگہوں ، بے چراغ موضعوں اور بھلائی ہوئی گذرگاہوں سے پھوٹتی رہتی ہے ، دل کی دھڑکن تیز کرنے والی آہٹ جو اُجاڑ بیابان میں آدمی کو پیچھے مڑ کر دیکھنے پر اکساتی ہے ۔ اس خوشبو اور آہٹ میں عبرتوں اور ہجرتوں کا فسانہ ہے ، اسی لیے اُداسی بھی ۔ اور منیر ان کا کھوجی ہے ان کے سراغ میں چلتا ہوا وہ جھٹپٹے سے آگے نکل گیا ہے وہ ماضی کی راہ سے مستقبل کو پہنچا ہے اور ہوا اس کی راہ نما ہے ، کیونکہ ہوا ہی خوشبوؤں اور سُروں کو پھیلاتی اور مٹاتی ہے اور ہوا میں نوحے اور زخم خوردگی کی ایسی کیفیت ہے جو تمام انسانی دکھوں سے ماورا معلوم ہوتی ہے ، اور وہ ہوا جو اندھیری شام کو چلے اور وہ جو آدھی رات کو " خوشبو کے ہار پرو کر " کسی راز کی طرح " پھُوٹ پھُوٹ کر روتی ہے " ——— ان سے زیادہ دل دُکھانے والا کون ہے ؟

منیر نیازی کی شاعری کے تین بڑے سمبل ہیں " ہوا " ، " شام " اور " موت " !

دشمن آدمی کے اندر بھی ہوتے ہیں ، باہر بھی ۔ شام دل میں بھی ہوتی ہے اور آسمان پر بھی ۔ اندھیرا جھک آنے پر روشنی کی موت کا سوگ ہوا یا شاعر کے سوا کون منا سکتا ہے ۔ کہتے ہیں عالمِ بالا میں ایک بہت پھیلاؤ والا گھنا درخت ہے جس پر ہمیشہ ایک ہی وقت میں خزاں اور بہار چھائی رہتی ہے

جب تیز ہوا کے جھونکے آتے ہیں تو کچھ پیلی مرجھائی پتیاں ٹوٹ کر گر جاتی ہیں! اور اسی طرح نیچے، دنیا میں، جہاں فنا کو قیام ہے، فانی انسان مرتے رہتے ہیں۔ یوں مجھے تو ہوا کی آواز میں موت کی ندا سنائی دیتی ہے۔ جو عالم بالا میں پکار پکار کر ہمارے ناموں کے پتے گراتی رہتی ہے "ٹوٹا پتّا ڈال سے لے گئی پون اڑا"۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام جدائیوں اور محبّتوں اور شکستوں میں ہوا کا ہاتھ ہے۔ ہوا کا سدا بول بالا رہے۔

منیر مسافر بھی تو ہے۔ شام کا مسافر۔ کہتے ہیں سفر وسیلہ ظفر ہے۔ ہوگا۔ منیر کے ہاں تو سفر وسیلہ خبر ہے —— نامعلوم کی خبر۔ دراصل یہ سفر ہے ہی ایسی چیز، ایک دفعہ آدمی چل کھڑا ہو تو پھر لوٹتا نہیں۔ تم ان سیمنٹ کے خولوں سے بڑے بڑے جھڑوس شہروں سے باہر نکلو تاکہ خود کو پا سکو، خواہشات اور علائق کے "دشت بلا" کو جس نے پار کر لیا سمجھو نروان پا لیا۔ صبح ہو یا شام، منیر کے ہاں سفر کا ذکر جھڑا رہتا ہے اور مصرعے پرندوں کی طرح پر تولتے رہتے ہیں۔ منیر شمالی یورپ کے دیوتا (ODIN) کی طرح ہے جس کے ساتھ ہمیشہ دو کوّے اڑتے رہتے تھے، اور کوا، تمہیں پتہ ہے، مستقبل کی خبر دیتا ہے کہ کون یا کیا آنیوالا ہے۔ کیا آنے والا ہے؟ اس کی خبر یا جھلک تو منیر کی نظموں ہی میں مل سکتی ہے۔ میں تو یہ بتا سکتا ہوں کہ جانے والا کون ہے۔

صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

ریل کی سیٹی سے بڑا اب سفر کا سمبل کیا ہو گا؟ رختِ سفر باندھ لو۔
——— مَیں چلا۔

محمد سلیم الرحمٰن

منیر نیازی کے شعری تجربے میں ان تجربوں کا میل ہے جو ہمارے اجتماعی تخیل کا حصہ ہیں۔ دشمنوں کے درمیان شام کی نظمیں اور غزلیں پڑھتے پڑھتے کبھی ان آفت زدہ شہروں کی طرف دھیان جاتا ہے۔ جہاں کوئی خطر پسند شہزادہ رنج سفر کھینچتا جا نکلتا تھا اور خلقت کو خوف کے عالم میں دیکھ کر حیران ہوتا تھا، کبھی عذاب کی زد میں آئی ہوئی ان بستیوں کا خیال آتا ہے، جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے، کبھی حضرت امام حسین کے وقت کا کوفہ نظروں میں گھومنے لگتا ہے۔ اس کے باوجود منیر نیازی، عہد کی شاعری کرنے والوں سے زیادہ عہد کا شاعر نظر آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد کے اندر رہ کر ایک آفت زدہ شہر دریافت کیا ہے۔ منیر نیازی کا عہد منیر نیازی کا کوفہ ہے۔ پھر پھر کر شہر کا ذکر بھی ایک معنی رکھتا ہے۔ اس سے شاعر کا اپنے اردگرد کے ساتھ گہرے رشتے کا پتہ چلتا ہے۔ ان نظموں میں جو استعاروں اور تلمیحوں کا ذخیرہ خرچ ہوا ہے اس سے کام لینے والوں نے یہ کام بھی لیا ہے کہ اردگرد سے بے تعلق ہو کر اپنی ذات کے پاتال میں اتر گئے۔ مگر منیر نیازی کے یہاں یہی ذخیرہ خارج سے رشتہ استوار کرنے کا فرض انجام دیتا ہے۔ یہ رشتہ بے شک دشمنی کا رشتہ ہے مگر دشمنی کے رشتے میں شدت بہت ہوتی ہے۔

انتظار حسین

وصال کی خواہش

کہہ بھی دے اب، وہ سب باتیں
جو دل میں پوشیدہ ہیں
سارے رُوپ دکھا دے مجھ کو
جو اب تک نادیدہ ہیں

ایک ہی رات کے تارے ہیں
ہم دونوں اس کو جانتے ہیں
دُوری اور مجبُوری کیا ہے
اس کو بھی پہچانتے ہیں

کیوں پھر دونوں مل نہیں سکتے
کیوں یہ بندھن ٹوٹا ہے
یا کوئی کھوٹ ہے تیرے دل میں
یا میرا غم جھوٹا ہے

ایک خیال

دنیا سے دُور اُس کی بھری محفلوں سے دُور
بھٹکا ہے دل ہوا کی طرح منزلوں سے دُور
اُٹھی ہے موجِ درد کوئی دل کے آس پاس
پھرتی ہے اک صدا سی کہیں ساحلوں سے دور

شام، خوف، رنگ

بجلی کڑک کے تیغِ شرر بار سی گری
جیسے گھٹا میں رنگ کی دیوار سی گری
دیکھا نہ جائے گا وہ سماں شام کا منیرؔ
جب بامِ غم سے خوشبو کوئی ہار سی گری

خُوبصُورت خیال

چھوڑو تو چھوٹ جائیں
پکڑو تو ٹوٹ جائیں
صابن کے بلبلے سے
رنگین آئینے سے

وہ دونوں

اک تصویرِ اداس
اک سایۂ خاموش
اپنے اپنے خواب میں
بُری طرح مدہوش

مینہ ہوا اور اجنبی شہر

بارش تھی، دیواروں پر اور کوٹھوں پر
اور گھروں کے گھنے درختوں پر
تُند ہوا تھی، چہروں پر، دروازوں پہ
اور خالی رستوں پہ
روشنیاں تھیں، کہیں کہیں
درگاہوں میں یا اُونچے سرد مکانوں میں
ہوگا وہ بھی وہیں کہیں
ویرانوں میں یا مرمر کے ایوانوں میں

ساتھیوں کی تلاش

کچھ اپنے جیسے لوگ ملیں
ان رنگ برنگے شہروں میں

کوئی اپنے جیسی لہر ملے
اِن سانپوں جیسی لہروں میں

کوئی تیز، نشیلا زہر ملے
اَن گنتی قسموں کے زہروں میں

ہم بھی نہ گھر سے باہر نکلیں
اِن سونی دوپہروں میں

دیکھنے والے کی اُلجھن

سُورج میں جو چہرے دیکھے اب ہیں سپنے سمان
اور شعاعوں میں اُلجھی سی
گیلے گیلے ہونٹوں کی وہ نئی لال مُسکان
جیسے کبھی نہ زندہ تھے یہ

چھوٹی چھوٹی اینٹوں والے ٹھنڈے برف مکان
کہاں گئی وہ شام ڈھلے کی
سَرسَر کرتی تیز ہوا کی دل پر کھچی کمان

اور سپنا جو نیند میں لایا
پوری ادھوری خواہشوں کا
اک درد بھرا طوفان
کیسے کوئی کر سکتا ہے ان سب میں پہچان

آدمی

بھولی باتیں یاد نہ آئیں
کیا کیا کوشش کرتا ہے

کون ہے وہ بس اسی سوچ کے
سائے سے بھی ڈرتا ہے

جیسے سُکھ کے طوفانوں میں
دُکھ کا ریلا پھرتا ہے

ساتھ اپنے جمگھٹا لگا کر
آپ اکیلا پھرتا ہے

گزرگاہ پر تماشا

کھلی سڑک ویران پڑی تھی
بہت عجب تھی شام

اُونچا قد اور چال نرالی
نظریں خوں آشام

سارے بدن پر مچا ہُوا تھا
رنگوں کا کہرام

لال ہونٹ یوں دہک رہے تھے
جیسے لہو کا جام

ایسا حُسن تھا اُس لڑکی میں
ٹھٹھک گئے سب لوگ

کیسے خوش خوش چلے تھے گھر کو
لگ گیا کیسا روگ

ساحلی شہر میں ایک رات

روشنیاں ہی روشنیاں اور نوحے تھکے جہازوں کے
بارش میں جادو کے منظر کھُلے ہوئے دروازوں کے

لاکھ جتن سے بھی نہیں مانا
دل کو دکھایا بیتے دن کے ہنگاموں کا تماشا بھی
شہر ہے سارا پتھر جیسا

میرا بھی دشمن ہے یہ اور اس کے لہو کا پیاسا بھی
میں بھی اپنی سوچ میں گم ہوں
پاگل ہو کر ناچ رہی وہ ہوٹل کی رقاصہ بھی

ساتواں در کھلنے کا سماں

ڈوب چلا ہے زہر میں اُس کی آنکھوں کا ہر رُوپ
دیواروں پر پھیل رہی ہے پھیکی پھیکی دھوپ
سناٹا ہے شہر میں جیسے ایسی ہے آواز
اک دروازہ کھلے گا جیسے کوئی پُرانا راز

حُسن میں گناہ کی خواہش

حُسن تو بس دو طرح کا خُوب لگتا ہے مجھے
آگ میں جلتا ہُوا
یا برف میں سویا ہُوا
درمیاں میں کچھ نہیں

صرف ہلکا سا اچنبھا، عکس سا اُڑتا ہُوا
اک خیال انگیز قصّہ اپنی آدھی موت کا
اک الم افزا فسانہ خُونِ دل کے شوق کا
اک کنارے سے صدا دو تو وہ چلتی جائے گی
دُور تک اپنے گُنہ پر ہاتھ ملتی جائے گی

دشمنوں کے درمیان شام

پھیلتی ہے شام دیکھو ڈوبتا ہے دن عجب
آسماں پر رنگ دیکھو ہو گیا کیسا غضب
کھیت ہیں اور اُن میں اک روپوش سے دشمن کا شک
سرسراہٹ سانپ کی گندم کی وحشی گرم مہک
اک طرف دیوار و در اور جلتی بجھتی بتّیاں
اک طرف سر پہ کھڑا یہ موت جیسا آسماں

کہسار مری میں سردیاں٭

چاند نکلا بادلوں سے رات گہری ہو گئی
جیسے یہ دنیا خدا کی گونگی بہری ہو گئی
دیکھ کر مجھ کو وہ ناگن اور زہری ہو گئی
جسم ریشم بن گیا رنگت سنہری ہو گئی
سر کے اُوپر شاخ تھی اور اُس کے اُوپر آسماں
آنکھ اُس کی سُرخ اور رنگت سنہری ہو گئی

لال پیلی چاندنی برفوں پہ ڈھلتی دیکھنا
بے ثمر اندھی نظر رنگوں سے جلتی دیکھنا
ایک خواہش سو طرح کے رُخ بدلتی دیکھنا

ڈھاکہ کے بلدا باغات میں تماشا

دُور تک جاتی ہُوئی پتّھر کی کالی سیڑھیاں
اور گہرے لال پتّے پیڑ کے
گھورتی دو نگاہیں ایک کالے جسم کی
بن کی پوشیدہ جگہوں کی اوٹ سے
دو عجائب گھر کے کمرے ایک خُونی داستاں
خوب صورت مرد و زن کی انجمن آرائیاں
اپنی حد سے آگے بڑھ کر گرم خوں کی تیزیاں
بے وفائی کی پرانی رسم کے سُود و زیاں
چھپ چلیں افلاک پر دیکھو شفق کی سُرخیاں
اک پُرانی شب کا قصّہ چھیڑ کے
دُور تک جاتی ہوئی پتّھر کی خالی سیڑھیاں
اور گہرے لال پتّے پیڑ کے

دھوپ میں ایک غیر آباد شہر کا نظارہ

ایک کنواں تھا بیچ میں اک پیتل کا مور
خالی شہر ڈراؤنا کھڑا تھا چاروں اور

دُھوپ میں دو سفید عورتیں

اُدھر تھا مندر بھیروں کا
اُدھر ہوا تھی راہوں میں
دُھوپ تھا شیشہ چاندی کا
چمک گیا جو نگاہوں میں

شبِ ماہ میں سیر کے دوران

ایک مکاں کے دس دروازے
کھُلے پڑے ہیں سارے
اندر باہر کوئی نہیں
کوئی چاہے لاکھ پکارے

میں جیسا بچپن میں تھا

مَیں جیسا بچپن میں تھا
اُسی طرح میں اب تک ہوں
کِھلے باغ کو دیکھ دیکھ کر
بُری طرح حیران
آس پاس مرے کیا ہوتا ہے
اس سب سے انجان

زندگی کی رنگا رنگی

دُکھ بھی تھا اُس کو شادی کا
خُوش بھی ہے وہ دیکھو کتنی

اپنے گھر کے صحن میں

دیواروں پر ہری بیل ہے
اس سے اُوپر تارے ہیں
سب سے اُوپر کھُلا آسماں
اور اُس کے نظّارے ہیں

خُدا کو اپنے ہمزاد کا انتظار

اُداس ہے تُو بہت خُدایا!
کوئی نہ تجھ کو سُنانے آیا

وہ سُر جو تیرے اُجاڑ دل میں
چراغ بن کر چمک رہی ہے
کوئی نہ تجھ کو دکھانے آیا

عجیب حُسنِ مہیب جیسی
خلش جو دل میں کھٹک رہی ہے

ایک دھندلا سا خواب

پھیکی کمان سی نئے چاند کی
اور اس کی خوشبُو
آس پاس گہرے رنگوں کا
زہریلا جادو
ایک پیڑ اور ایک سانپ سا
اِک میں اور اِک تُو

ہونے کا غم کس کو نہیں

ہونے کا غم اُسے بھی ہے
اور مُجھ کو بھی
کبھی نہ ہونے کا اندیشہ
اُسے بھی ہے اور مُجھ کو بھی

ایک لمحہ تیز سفر کا

اِک ربن کسی کی زلفوں کا
بیمار مہک کسی جنگل کی
رنگین جھلک کسی بادل کی

دروازے بڑے مکانوں کے
کچھ پھول کھلے دالانوں کے
کچھ رنگ چھپے ویرانوں کے
فانوس کھلی دکانوں کے

اک لڑی ہیں اُڑتے آتے ہیں
اور واپس مُڑتے جاتے ہیں

ایک بہادر کی موت

زخمی دشمن حیرت میں ہے
ایسا بھی ہو سکتا تھا
اس کو شاید خبر نہیں تھی

اب وہ گہری حیرت میں ہے

آسمان پر رب ہے اُس کا اور صدائیں یاروں کی
آس پاس شکلیں ہیں اُس کے لہُو لہان سواروں کی
دِل میں اُس کے خلش ہے کوئی، شاید گئی بہاروں کی
کھیل ذرا ہونی کے دیکھو اور جفا غداروں کی

فتح کے بدلے موت ملی اُسے گھر سے دُور دیاروں کی

ایک شہر میں شام

چلی ہوائیں باغوں میں
اُڑے ہیں رنگ چراغوں میں
چھُپا ہے غم آوازوں میں
کھلے ہُوئے دروازوں میں

آدھی رات میں ایک نیم وا دریچہ

آدھا چہرہ روشنی میں ہے آدھا کالے پردے میں
ایک آنکھ ہے سُورج جیسی ایک ہے کالے پردے میں

بھید نہ اب تک باہر آیا آدھے گرے نقابوں سے
آنکھ ہمیشہ گھری رہی ظاہر اور چُھپے سرابوں سے

سیرِ سحر آب زار بنگال

رخصتِ سرما کی صبح سرد ، نم ، سنگین سی
خوابِ خاموشی کی تہ میں اک جھلک رنگین سی

بانس کا جنگل ، ہوا ، پانی پرانی جھیل کا
سبز ڈر پر رنگ جیسے آسمان کے نیل کا

گرتے جاتے شہر دونوں سمت اک انبار میں
کھنچتی جاتی خاکِ میداں ایک ہی رفتار میں

ہلتے جاتے نقش سے کچھ پھیلتی دیوار پر
بُجھ کے گرتے حرف سے حدِ سفر آثار پر

ہر طرف خُوشبو ہوا میں ، بن میں ، قربِ آب کی
ایک پُر اسرار خواہش دل میں مرگِ آب کی

ایک دوزخی شہر پر بادلوں کے لیے دُعا

گرم رنگ پھُولوں کا
گرم تھی مہک اُن کی
گرم خوُن آنکھوں میں
تیز تھی چمک اُن کی

سوچتا میں کیا اُس کو
اُس حسیں کی باتوں کو
دیکھتا میں کیا اُس کے
خاک رنگ ہاتھوں کو

خوف تھا تمازت میں
عیشِ شب کی شدت کا
دَر کھُلا تھا دوزخ کا
لمسِ لب کی حدت کا

مَیں جواب کیا دیتا
اُس کی اُن اداؤں کا
ایک شہرِ مردہ میں
دُور کی نداؤں کا

سحرِ زرد باطن میں
پانچ بند اسموں کا
بن گیا تھا جسموں میں
زہر پانچ قسموں کا

بے سُود سفر کے بعد آرام کا پل

پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹھنا شام و سحر
پھر وہی خوابِ تمنّا پھر وہی دیوار و در

بلبلیں ، اشجار ، گھر ، شمس و قمر
خوف میں لذّت کے مسکن ، جسم پر اُن کا اثر

موسموں کے آنے جانے کے وہی دل پر نشاں
سات رنگوں کے علَم نیلے فلک تک پر فشاں

صُبح دم سُونے محلّے بھیگی بھیگی سہ پہر
پھُول گرتے دیکھنا شاخوں سے فرشِ شام پر

خواب اُس کے دیکھنا موجُود تھا جو بام پر
پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹھنا شام و سحر

حرفِ سادہ و رنگیں

اک کلی گلاب کی
کوچۂ چمن میں ہے
یاد ایک خواب کی
شام کے گگن میں ہے
اسم سبز باب کا
پُر فریب بن میں ہے
نقش اک شباب کا
سایۂ کہن میں ہے
اِک پکارتی صدا
جبر کے گھٹن میں ہے
دُور دُور تک ہوا
کوہ اور دمن میں ہے

حصّہ غزل

○

کس انوکھے دشت میں ہو اے غزالانِ ختن
یاد آتا ہے تمہیں بھی اب کبھی اپنا وطن

خوں رُلاتی ہے مجھے اک اجنبی چہرے کی یاد
رات دن رہتا ہے آنکھوں میں وہی لعلِ یمن

عطر میں ڈوبی ہُوئی ہے کوئے جاناں کی ہوا
آہ اُس کا پیرہن اور اس کا صندل سا بدن

رات اب ڈھلنے لگی ہے بستیاں خاموش ہیں
تو مجھے سونے نہیں دیتی مرے جی کی جلن

یہ بھبھوکا لال مکھ ہے اس پری وش کا منیر
یا شعاعِ ماہ سے روشن گلابوں کا چمن!

○

دیتی نہیں اماں جو زمیں آسماں تو ہے
کہنے کو اپنے دل سے کوئی داستاں تو ہے

یوں تو ہے رنگ زرد مگر ہونٹ لال ہیں
صحرا کی وسعتوں میں کہیں گلستاں تو ہے

اک چیل ایک ممٹی پہ بیٹھی ہے دھوپ میں
گلیاں اُجڑ گئی ہیں مگر پاسباں تو ہے

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

مجھ سے بہت قریب ہے تو پھر بھی اے منیر
پردہ سا کوئی میرے ترے درمیاں تو ہے

○

جمالِ یار کا دفتر رقم نہیں ہوتا
کسی جتن سے بھی یہ کام کم نہیں ہوتا

تمام اُجڑے خرابے حسیں نہیں ہوتے
ہر اک پرانا مکاں قصرِ جم نہیں ہوتا

تمام عمر رہِ رفتگاں کو تکتی رہے
کسی نگاہ میں اتنا تو دم نہیں ہوتا

یہی سزا ہے مری اب جو میں اکیلا ہوں
کہ میرا سر ترے آگے بھی خم نہیں ہوتا

وہ بے حسی ہے مسلسل شکستِ دل سے منیر
کوئی بچھڑ کے چلا جائے غم نہیں ہوتا

○

وہ اک خیال جو اُس شوخ کی نگاہ میں تھا
اُسی کا عکس مرے دل کی سردِ آہ میں تھا

اُسی طرح وہ پُرانی بہار باقی تھی
عجیب حُسن سا اُس حُزنِ بارگاہ میں تھا

شفق کا رنگ جھلکتا تھا لال شیشوں میں
تمام اُجڑا مکاں شام کی پناہ میں تھا

میں اُس کو دیکھ کے چپ تھا اُسی کی شادی میں
مزا تو سارا اسی رسم کے نباہ میں تھا

سوادِ شہر پہ ہی رک گیا تھا میں تو منیر
اور ایک دشتِ بلا میرے گھر کی راہ میں تھا

○

ابر میں برق کے گلزار دکھاتے اُس کو
کاش اُس رات کبھی جا کے جگاتے اُس کو

شہ نشینوں پہ ہوا پھرتی ہے کھوئی کھوئی
اب کہاں ہیں وہ مکیں یہ تو بتاتے اُس کو

وہ جو پاس آ کے یونہی چپ سا کھڑا رہتا تھا
اُس کی تو خُو تھی یہی تم ہی بُلاتے اُس کو

غمگساری کی طلب تھی یہ محبت تو نہ تھی
درد جب دل میں اُٹھا تھا تو چھپاتے اُس کو

فائدہ کیا ہے اگر اب وہ ملے بھی تو منیر
عمر تو بیت گئی راہ پہ لاتے اُس کو

○

یہ بے صدا سنگ و در اکیلے
اُجاڑ سُنسان گھر اکیلے

چلے جو پی کے تو مستیوں میں
گئے کہاں بے خبر اکیلے

مہیب بن تھا چہار جانب
کٹا تھا سارا سفر اکیلے

ہوا سی رنگوں میں چل رہی ہے
کھڑے ہیں وہ بام پر اکیلے

ہے شام کی زرد دھوپ سر پہ
ہوں جیسے دن میں نگر اکیلے

منیر گھر سے نکل کے ہم بھی
پھرے بہت در بدر اکیلے

○

اک تیز تیر تھا کہ لگا اور نکل گیا
ماری جو چیخ ریل نے جنگل دہل گیا

سویا ہُوا تھا شہر کسی سانپ کی طرح
میں دیکھتا ہی رہ گیا اور چاند ڈھل گیا

خواہش کی گرمیاں تھیں عجب اُن کے جسم میں
خوباں کی صحبتوں میں مرا خُون جل گیا

تھی شام زہر رنگ میں ڈوبی ہُوئی کھڑی
پھر اک ذرا سی دیر میں منظر بدل گیا

مدّت کے بعد آج اُسے دیکھ کر منیر
اک بار دل تو دھڑکا مگر پھر سنبھل گیا

○

صحن کو چمکا گئی بیلوں کو گیلا کر گئی
رات بارش کی فلک کو اور نیلا کر گئی

دھوپ ہے اور زرد پھولوں کے شجر ہر راہ پر
اک ضیائے زہر سب سڑکوں کو پیلا کر گئی

کچھ تو اُس کے اپنے دل کا درد بھی شامل ہی تھا
کچھ نشے کی لہر بھی اُس کو سُریلا کر گئی

بیٹھ کر میں لکھ گیا ہوں دردِ دل کا ماجرا
خون کی اک بوند کاغذ کو رنگیلا کر گئی

○

اس شہرِ سنگ دل کو جلا دینا چاہیئے
پھر اس کی خاک کو بھی اُڑا دینا چاہیئے

ملتی نہیں پناہ ہمیں جس زمین پر
اک حشر اُس زمیں پہ اُٹھا دینا چاہیئے

حد سے گزر گئی ہے یہاں رسمِ قاہری
اس دہر کو اب اس کی سزا دینا چاہیئے

اک تیز رعد جیسی صدا ہر مکان میں
لوگوں کو اُن کے گھر میں ڈرا دینا چاہیئے

گم ہو چلے ہو تم تو بہت خود میں اے منیرؔ
دنیا کو کچھ تو اپنا پتہ دینا چاہیئے

○

دل خوف میں ہے عالمِ فانی کو دیکھ کر
آتی ہے یاد موت کی پانی کو دیکھ کر

ہے بابِ شہرِ مردہ گزرگاہِ بادِ شام
میں چپ ہوں اس جگہ کی گرانی کو دیکھ کر

ہل سی رہی ہے حدِ سفر فرطِ شوق سے
دھندلا رہے ہیں حرف معانی کو دیکھ کر

آزردہ ہے مکان میں خاکِ زمین بھی
چیزوں میں شوقِ نقلِ مکانی کو دیکھ کر

ہے آنکھ سُرخ اُس لبِ لعلیں کے عکس سے
دل خوں ہے اس کی شعلہ بیانی کو دیکھ کر

پردہ اُٹھا تو جیسے یقیں بھی اُٹھا منیر
گھبرا اُٹھا ہوں سامنے ثانی کو دیکھ کر

○

تُند نشہ خمار سا نکلا
آسماں بھی غبار سا نکلا

کیا اندھیرے میں روشنی سی رہی
رنگِ لب کا شرار سا نکلا

تلخیِ غم نکل گئی دل سے
جسم سے اک بخار سا نکلا

دیکھ کر حسنِ دشت حیراں ہوں
یہ تو منظر دیار سا نکلا

میں ہوں بیمارِ وصلِ گُل سے منیرؔ
شوقِ دل مرگ زار سا نکلا

○

اُس شہر کے یہیں کہیں ہونے کا رنگ ہے
اس خاک میں کہیں کہیں سونے کا رنگ ہے

پائیں چمن ہے خود رو درختوں کا جھنڈ سا
محرابِ در پہ اُس کے نہ ہونے کا رنگ ہے

طوفانِ ابر و بادِ بلا ساحلوں پہ ہے
دریا کی خامشی میں ڈبونے کا رنگ ہے

اس عہد سے وفا کا صلہ مرگِ رائگاں
اس کی فضا میں ہر گھڑی کھونے کا رنگ ہے

سُرخی ہے جو گلاب سی آنکھوں میں اے منیر
خارِ بہار دل میں چبھونے کا رنگ ہے

○

شبِ وصال میں دُوری کا خواب کیوں آیا
کمالِ فتح میں یہ ڈر کا باب کیوں آیا

دلوں میں اب کے برس اتنے وہم کیوں جاگے
بلادِ صبر میں اب اضطراب کیوں آیا

ہے آب گل پہ عجب اس بہارِ گزراں میں
چمن میں اب کے گُلِ بے حساب کیوں آیا

اگر وہی تھا تو رُخ پہ وہ بے رُخی کیا تھی
ذرا سے ہجر میں یہ انقلاب کیوں آیا

بس ایک ہُو کا تماشا تمام سمتوں پر
مری صدا کے سفر میں سراب کیوں آیا

میں خوش نہیں ہوں بہت دُور اس سے ہونے پر
جو میں نہیں تھا تو اُس پر شباب کیوں آیا

اُڑا ہے شعلۂ برق ابر کی فصیلوں پر
یہ اس بلا کے مقابل سحاب کیوں آیا

یقین کس لیے اُس پر سے اُٹھ گیا ہے منیر
تمہارے سر پہ یہ شک کا عذاب کیوں آیا

○

قرارِ ہجر میں اس کے شراب میں نہ ملا
وہ رنگ اُس گلِ رعنا کا خواب میں نہ ملا

عجب کشش تھی نظر پر سرابِ صحرا سے
گُہر مگر وہ نظر کا اس آب میں نہ ملا

بس ایک ہجرتِ دائم گھروں زمینوں سے
نشانِ مرکزِ دل اضطراب میں نہ ملا

سفر میں دھوپ کا منظر تھا اور سائے کا اور
ملا جو مہر میں مجھ کو سحاب میں نہ ملا

ہوا نہ پیدا وہ شعلہ جو علم سے اُٹھتا
یہ شہر مردہ صحیفوں کے باب میں نہ ملا

مکاں بنا نہ یہاں اس دیارِ شر میں منیر
یہ قصرِ شوق نگر کے عذاب میں نہ ملا

○

ہری ٹہنیوں کے نگر پر سے گئے
ہوا کے پرندے شجر پر گئے

اک آسیبِ زر ان مکانوں میں ہے
مکیں اس جگہ کے سفر پر گئے

بہت دھند ہے اور وہ نقشِ قدم
خُدا جانے کس رہ گزر پر گئے

کہ جیسے ابھی تھا یہاں پر کوئی
گماں کیسے خوابِ سحر پر گئے

کئی رنگ پیدا ہُوئے برق سے
کئی عکس دیوار و در پر گئے

وہی حسنِ دیوانہ گر ہر طرف
سبھی رُخ اُسی کے اثر پہ گئے

منیر آج اتنی اداسی ہے کیوں
یہ کیا سائے سے بحر و بر پہ گئے

○

چمن میں رنگِ بہار اُترا تو میں نے دیکھا
نظر سے دل کا غبار اُترا تو میں نے دیکھا

میں نیم شب آسماں کی وسعت کو دیکھتا تھا
زمیں پہ وہ حسن زار اُترا تو میں نے دیکھا

گلی کے باہر تمام منظر بدل گئے تھے
جو سایۂ کوئے یار اُترا تو میں نے دیکھا

خمارِ مے میں وہ چہرہ کچھ اور لگ رہا تھا
دمِ سحر جب خمار اُترا تو میں نے دیکھا

اک اور دریا کا سامنا تھا منیرؔ مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

شعاعِ مہرِ منور شبوں سے پیدا ہو
متاعِ خوابِ مسرّت غموں سے پیدا ہو

مری نظر سے جو گم ہو گیا وہ ظاہر ہو
صراطِ شہرِ صفا الجھنوں سے پیدا ہو

گلِ مراد! سرِ دشتِ نامرادی کھل
رخِ نگارِ وفا محملوں سے پیدا ہو

گماں نہیں مجھے جس سمت سے وہاں سے آ
جو میں نے دیکھی نہیں اُن جگہوں سے پیدا ہو

ہویدا ہو دمِ زندہ ہجومِ مردہ سے
اے اصلِ شوق غلط خواہشوں سے پیدا ہو

مثالِ قوسِ قزح بارشوں کے بعد نکل!
جمالِ رنگ، کھلے منظروں سے پیدا ہو

فروغِ اسمِ محمد ہو بستیوں میں منیر
قدیم یاد، نئے مسکنوں سے پیدا ہو

○

سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں
اُن اُمتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں

کر یاد اُن دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں

صرصر کی زد میں آئے ہُوئے بام و در کو دیکھ
کیسی ہوائیں کیسا نگر سرد کر گئیں

کیا باب تھے یہاں جو صدا سے نہیں کھلے
کیسی دُعائیں تھیں جو یہاں بے اثر گئیں

تنہا اُجاڑ برجوں میں پھرتا ہے تو منیر
وہ زرفشانیاں ترے رُخ کی کدھر گئیں

○

بس ایک ماہِ جنوں خیز کی ضیا کے سوا
نگر میں کچھ نہیں باقی رہا ہوا کے سوا

ہے ایک اور بھی صورت کہیں مری ہی طرح
اک اور شہر بھی ہے قریۂ صدا کے سوا

اک اور سمت بھی ہے اس سے جا کے ملنے کی
نشان اور بھی ہے اِک نشانِ پا کے سوا

زوالِ عصر ہے کوفے میں اور گداگر ہیں
کھلا نہیں کوئی در بابِ التجا کے سوا

مکان، زر، لبِ گویا، حدِ سپہر و زمیں
دکھائی دیتا ہے سب کچھ یہاں خدا کے سوا

مری ہی خواہشیں باعث ہیں میرے غم کی منیرؔ
عذاب مجھ پہ نہیں حرفِ مدعا کے سوا

○

کیسی ہے رہگذار وہ دیکھیں گے جا کے اب اُسے
بیت گئے برس بہت دیکھا تھا ہم نے جب اُسے

جاگے گا خوابِ ہجر سے آئے گا لوٹ کر یہیں
دیکھیں گے خوف و شوق سے روزن و در سے سب اُسے

صحرا نہیں یہ شہر ہے اور بھی لوگ ہیں یہاں
چاروں طرف مکاں ہیں اتنا ہے ہوش کب اُسے

کہنے کو بات کچھ نہیں جانا ہے اس کو تجھ کو بھی
کیوں تو کھڑا ہے راہ میں روک کے بے سبب اُسے

باغوں میں جا، اے خوش نوا آئی بسنت کی ہوا
زرد ہوا ہے بن عجب، جادو چڑھا عجب اُسے

اک اک ورق ہے بابِ زر نیری غزل کا اے منیر
جب یہ کتاب ہو چکے جا کے دکھانا تب اُسے

بھیروں بہار کا خیال

لاگی لگن گھر گھر
پت جھڑ کی ہے بہار
آنکھوں میں انتظار
ڈھلے چاند دل کے پار
لاگی لگن ——————

ایک اجنبی دیار
چلے ہوا سوگوار
دل میں وہم بے شمار
ایک دور کی پکار
آ رہی ہے بار بار
لاگی لگن ——————

ایک احتمال

شاید وہ ملے انہی راہوں پر جن راہوں پر چھوڑا تھا اُسے
کرنوں کی کلیاں چنتے ہُوئے
مری جانب دوڑتے آتے ہُوئے
پھر رک کر واپس جاتے ہُوئے
شاید وہی موسم اب تک ہو جس موسم میں دیکھا تھا اُسے

خزاں زدہ باغ پر بوندا باندی

آمدِ باراں کا سناٹا
کبھی کبھی اس سناٹے میں ٹوٹ کے گرتے پتے
دیو آسا اشجار کھڑے ہیں
کہیں کہیں اشجار تلے ویران پرانے رستے

لے کے چلیں آوارہ ہوائیں
ایک نشانی اس کی جو تھی اس کو واپس پہنچانے
آج بہت دن بعد آئی ہے شام یہ چادر تانے
اک وعدہ جو میں نے کیا تھا اس کی یاد دلانے

آج بہت دن بعد ملے تھے گہری پیاس اور پانی
ساحلوں جیسا حُسن کسی کا اور میری حیرانی

٭٭٭

ماہِ منیر
منیر نیازی

ماہِ منیر

فہرست

غزلیں

کھلے منظروں کی دنیا

(۱)

منیر نیازی کی شاعری ایک طویل جلاوطنی کے بعد وطن کی پہلی جھلک دیکھنے سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس شاعری میں حیران کردینے اور بھولے ہوئے گم شدہ تجربوں کو زندہ کرنے کی ایک ایسی غیر معمولی صلاحیت ہے جو اس عہد کے کسی دوسرے شاعر میں نظر نہیں آتی۔ اس عہد کے اکثر شاعروں کی وابستگی نظریات یا علوم کے ساتھ ہے، جب کہ منیر کی وابستگی شاعری کی "اصل" یا شاعری کے جوہر کے ساتھ ہے۔ خود کو بطور شاعر شناخت کر کے اپنے وجود کا بطور شاعر ادراک اور اس پر ایمان، منیر کو اس عہد کے آدھے شاعروں کے درمیان ایک پورے شاعر کا رتبہ دیتا ہے۔

منیر نیازی کے نزدیک شاعری پورے عہد کے طرز احساس اور رویوں کا عطر ہے۔ منیر اپنے عہد کے رویوں اور نظریات کی "منظوم تشریحیں" نہیں کرتا، وہ تو بے معنی تفصیل کا بھی قائل نہیں، وہ چند سطور اور چند تصویروں میں اپنے عہد کے انسانوں اور ان کے رویوں کی اصل بنیاد کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ پھر اگر آپ چاہیں تو ان تصویروں سے معانی کی طویل داستانیں مرتب کر سکتے ہیں۔ معانی کی انہی امکانی سمتوں کی وجہ سے منیر کی شاعری کو کسی ایک سطح یا عمر کے کسی ایک حصے سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر سطح کا انسان اس شاعری میں اپنے ذہن کے مطابق سمتیں تلاش کر سکتا ہے۔

منیر کی شاعری میں انسانی زندگی کے جہنمی میدان بھی ہیں اور انسان کی کھوئی ہوئی جنت بھی ہے۔ منیر نے انسانی کردار اور انسانی زندگی کے دونوں حصوں سے آنکھیں چار کی ہیں، اگر اس کے یہاں ایک طرف قتل، دہشت اور ویرانی کا علاقہ ہے تو دوسری

طرف معصومیت، حُسن اور رنگوں کے خطّے بھی ہیں۔ منیر کی شاعری ان دونوں عناصر
سے مل کر ہی اکائی کی صورت اختیار کرتی ہے۔

منیر کی شاعری انسان کو اُس کی ذات کے اوّلیں نقش کی یاد دلاتی ہے۔ بینی گال
کا مشہور شاعر سینگور ایک نظم میں لکھتا ہے

"مجھے علم نہیں یہ سب کچھ کب ہوا تھا
میں تو بہشت اور بچپن کو ہمیشہ ایک دوسرے سے ملا دیتا ہوں"

منیر کی شاعری میں انسان کو اُس کا بچپن اور بچپن کے ساتھ پیوست بہشت کی
یاد دلانے کا جو جادو ہے وہ اسی بات سے ظاہر ہے کہ منیر کی شاعری پر لکھتے ہوئے
اکثر دوستوں کو اپنی چھوڑی ہوئی بستیاں یا اپنا بچپن یاد آیا ہے۔ خود میں بھی اس شاعری
کو اپنے بچپن اور اپنی اولیں یادوں سے الگ نہیں کر سکتا۔ بلکہ میرا معاملہ تو باقی لوگوں سے
بھی آگے کا ہے۔ اس لیے کہ منیر نہ صرف مجھے میرا بچپن یاد دلاتا ہے بلکہ بچپن اور بہشت کی
سرحد پر میرے لہو میں گم شدہ بعض نادیدہ بستیوں کو بھی میرے سامنے لاتا ہے، جہاں
گھروں کی دیواروں پر مور بیٹھے رہتے تھے، آموں کے باغوں میں کوئلیں بولتی تھیں اور
آسمان پر ہر طرف کالی گھٹائیں ناچتی رہتی تھیں۔

بہر حال یہ منیر کی شاعری کے ساتھ میرا ذاتی رشتہ ہے۔ اس کا زیادہ بیان میں اس
وقت نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی اس شاعری کو محض بچپن کی حدود میں رکھ کر سمجھا جا سکتا
ہے۔ اس لیے میں منیر کی تازہ کتاب "ماہِ منیر" کے سلسلے میں چند باتوں پر اکتفا
کروں گا۔

(۲)

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے "ماہِ منیر" نئے مکانی فاصلوں کی وسعت کا سفرنامہ
ہے۔ اسی لیے ان نظموں اور غزلوں کا تناظر جدید شاعری کی گھٹن اور تنگیٔ مناظر سے

بالکل علیحدہ ہے۔ یہ ایک مسلسل سفر کی کائنات ہے اور یہ سفر اس کائنات کو پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ منیر نیازی کی نظموں اور غزلوں کا یہ نیا منطقہ ہمیں ایک نئی کونیات cosmology سے دوچار کر رہا ہے۔ اس کونیات کی وسعت کے مقابل نگر کی زندگی "نظربندی کا عالم" بن جاتی ہے اور مکان کی چار دیواری میں "خواہشِ سیرِ بسیط"، صحن کی محراب میں فلک کا اثر دکھا کر پرواز پہ مائل کرتی ہے۔ یہی مرحلہ ہے جہاں اجرامِ فلکی شاعر کے استعاروں اور علامتوں کی صورت میں ظہور کرتے ہیں

زمین دُور سے تارہ دکھائی دیتی ہے
رکا ہے اس پہ قمر چشمِ سیر بین کی طرح
فریب دیتی ہے وسعت نظر کی اُفقوں پر
ہے کوئی چیز وہاں سحرِ نیلمیں کی طرح

یہ تو ابھی آغاز ہے جیسے اس پہنائے حیرت کا
آنکھ نے اور سنور جانا ہے رنگ نے اور نکھرنا ہے

"ماہِ منیر" کھلے منظروں کی کائنات ہے، اس لیے ان نظموں میں بار بار چمک اور مختلف مظاہر پر اس چمک کے اثر کا بیان ہوا ہے۔ ان نظموں اور غزلوں میں جو تصویریں بار بار سامنے آتی ہیں وہ اسی چمک اور اسی نور سے مناظر کی رنگت تبدیل ہونے کی داستان بیان کرتی ہیں۔ یہاں نیلے سمندر اور اُس پہ دھوپ کے شیشے کی چمک کا رشتہ بھی ہے اور کسی چشمِ نم پہ مہر کی اولیں کرن کا اثر بھی۔ یہ نورِ خورشید سے چمکتے ہوئے دریچے بھی ہیں اور چاند کی روشنی کا مکانوں کی سبز رنگت کے ساتھ پر اسرار رابطہ بھی۔ کھلے منظروں کی اس کائنات میں پھیلاؤ اور فراخ سمتی کے امکانات کی تلاش کا سفر ہر

آج جاری رہتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں "دشمنوں کے درمیان شام" کی نظموں کی طرح کائنات سے بنیادی رشتہ دشمنی کا نہیں اور نہ ہی "تیز ہوا اور تنہا پھول" اور "جنگل میں دھنک" کی بہت سی نظموں کی طرح جنگل کی زیادہ تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ نظمیں تو "صحرا" یا میدان" کے تلازمات کو نئی معنویت دیتی ہیں۔ کھلے میدان یا صحرا میں ایک نئی کائنات آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب چاند، ستارے، فلک، سورج اور خلا اس شاعری کے بنیادی اسم بن جاتے ہیں

نیلِ فلک کے اسم میں نقشِ اسیر کے سبب
حسن ہے آب و خاک میں ماہِ منیر کے سبب

مکاں میں قیدِ صدا کی دہشت
مکاں کے باہر خلا کی دہشت
زمیں پہ ہر سمت حدِ آخر
فلک پہ لا انتہا کی دہشت

ہو کشتِ ثمر ور کہ ویراں چمن
نیا شہرِ امکاں کہ یادوں کا بن
ستارے مرے خوابِ امید کے

اسی پس منظر میں خود "ماہِ منیر" کے اسم کی معنویت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ ان نظموں اور غزلوں میں تلازمات کا جو جھرمٹ ہے، اس کے وسیلے سے "چاند" اور "زمین" کے مابین کئی رشتے قائم ہوتے ہیں۔ اس شعری نظام میں مرکزی حیثیت چاند ہی کی ٹھہرتی ہے۔ اس لیے کہ "ماہِ منیر" وہ اسم ہے جو منظروں کو تبدیل کر دیتا ہے۔ چاند نکلتے ہی

سیہ خانوں کی رنگت بدلتی ہے اور آب و خاک میں حسن کا نور جاگتا ہے۔ ان نظموں میں چاند اور زمین کا تعلق حیرت، کشش اور خوف کا ملا جلا تجربہ ہے اور اس تجربے سے ایک کونیاتی داستانِ عشق مرتب ہوتی ہے

"تیز ہوا اور تنہا پھول" میں چاند کے ساتھ جو تلازمے وابستہ تھے وہ قدیم زمانوں کے انسان کے ذہن کی کیفیات کے مظہر تھے۔ منیر کے اس اولیں مجموعۂ کلام کا چاند قدیم قبائلی زندگی کے تناظر میں "پوجا" اور "حملے" کے سیاق و سباق کو سامنے لاتا ہے اور یوں انسان کے بعض اولیں ذہنی ارتعاشات سے آشنا کرتا ہے۔

میں تیغ ہاتھ میں لیے سوئے فلک گیا
جذبوں کے رس میں ڈوبے ہوئے چاند تک گیا
کافی تھا ایک وار مری تیغ تیز کا
مہتاب کے بدن سے لہو پھوٹ کر بہا

(شب خون)

وہ ویراں باغوں میں جا کر
چاند نکلتا دیکھتے ہیں
جب مشرق پر روشنی کا
اک تیز نشان چمکتا ہے
وہ سرگوشی کے لہجے میں
کچھ منتر پڑھنے لگتے ہیں

(ایک رسم)

ان نظموں کے چاند کو "ماہِ منیر" کے "قمر" کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو ایک نئے چاند سے سامنا ہوتا ہے۔ اس چاند کے ساتھ قبائلی زندگی، پوجا یا جنگ کے تلازمے

وابستہ نہیں۔

یہ کھلے منظروں کا چاند ہے جو قبائلی تصورات کی پراسراریت میں ڈوبا ہوا نہیں، بالکل شفاف اور صاف ہے۔

کھوہ کے باہر سبز جھروکا اس کے پیچھے چاند ہے
جس کی صاف کشش کے آگے رنگ زمیں کا ماند ہے
تیز ضیا چہروں پہ آئی کیسے بندھن توڑ کے
کیسی دور دراز جگہوں کے دلکش منظر چھوڑ کے
مٹتے بنتے نقش ہزاروں گھٹتی بڑھتی دوریاں
ایک طرف پر وصل کا قصہ تین طرف مجبوریاں

(خاکی رنگ کی پریشانی میں خواب)

منیر اپنی بعض تازہ نظموں میں چاند سے سورج کی طرف سفر کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے اور ان نظموں میں سورج اور اس کی چمک کے تلازمات ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس کونیاتی سفر سے میرا دھیان بار بار حضرت ابراہیم کے قصے کی طرف منتقل ہوا، خصوصاً اس کے لیے بھی کہ اس مجموعے کا آغاز حمدیہ نظموں سے ہو رہا ہے۔ کونیات کا پھیلاؤ مظاہر سے آگے کسی عظیم تر حقیقت کے ادراک کے مرحلے سے بھی دوچار کرتا ہے۔ یوں بھی اب منیر کی شاعری پر قرآن حکیم کے مطالعے کے اثرات واضح طور پر سامنے آنے لگے ہیں۔

میں نے منیر نیازی کی اس تازہ کتاب کے محض ایک رخ کا ذکر کیا ہے۔ منیر کے لہجے میں اب جو تفکر اور ارتکاز پیدا ہوا ہے وہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ اسی طرح ان نظموں اور غزلوں میں اپنے عہد کی زندگی اور رویّوں کا جو شعور ہے اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔

منیر نیازی کا یہ مجموعہ اس کے فن کی نئی سمتوں اور ان نئی سمتوں سے آگے امکانی دنیاؤں کی خبر دیتا ہے۔

سہیل احمد، جون ۱۹۸۷ء
لاہور

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے نام

حمد

اُسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں
اور اُن کے درمیاں جو ہیں، مکینوں اور مکانوں میں

ہوا چلتی ہے باغوں میں تو اُس کی یاد آتی ہے
ستارے، چاند، سورج ہیں سبھی اُس کے نشانوں میں

اُسی کے دم سے طے ہوتی ہے منزل خوابِ ہستی کی
وہ نام اک حرفِ نورانی ہے ظلمت کے جہانوں میں

اُسی کے پاس اسرارِ جہاں کا علم ہے سارا
وہی برپا کرے گا حشر آخر کے زمانوں میں

وہ کر سکتا ہے جو چاہے، وہ ہر اک شے پہ قادر ہے
وہ سُن سکتا ہے رازوں کو جو ہیں دل کے خزانوں میں

بچا لیتا ہے اپنے دوستوں کو خوفِ باطل سے
بدل دیتا ہے شعلوں کو مہکتے گلستانوں میں

منیرؔ اس حمد سے رتبہ عجب حاصل ہوا تجھ کو
نظیر اس کی ملے شاید پرانی داستانوں میں

حمد

شامِ شہرِ ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تُو
یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تُو

آرزو دیتا ہے دل کو، موت کی، وقتِ دُعا
میری ساری خواہشوں کا یہ صلہ دیتا ہے تُو

حد سے بڑھ کر سبز ہو جاتا ہے جب رنگِ زمیں
خاک میں اس نقشِ رنگیں کو مِلا دیتا ہے تُو

تیز کرتا ہے سفر میں موجِ غم کی یورشیں
بجھتے جاتے شعلۂ دل کو ہوا دیتا ہے تُو

ماند پڑ جاتی ہے جب اشجار پر ہر روشنی
گھُپ اندھیرے جنگلوں میں راستہ دیتا ہے تُو

دیر تک رکھتا ہے تُو ارض و سما کو منتظر
پھر انہی ویرانیوں میں گل کھلا دیتا ہے تُو

جس طرف سے تُو گزر جاتا ہے اے جانِ جہاں!
دُور تک اک خواب کا منظر بنا دیتا ہے تُو

اے منیرؔ اس رات کے افلاک پر ہوتا تیرا
اِک حقیقت کو فسانہ سا بنا دیتا ہے تُو

حمد

تسکیں اُتارتا ہے دلوں میں خُدا کا نام
خوشبو بکھیرتا ہے گلوں میں خُدا کا نام

دیتا ہے طائروں کو نواؤں کی دل کشی
رہتا ہے جن سے خالی جگہوں میں خُدا کا نام

آتا ہے مثلِ حرفِ بشارت دمِ سحر
بادِ سحر کے ساتھ گھروں میں خُدا کا نام

حمدِ قدیم

کیسے گزرے شام
کیوں کر آئے یاد
وہ بھُولا ہُوا نام
بے چینی ہو دُور
دل کو ملے آرام
کب یہ بے کل شام
رنج سے ہو آزاد
کب یہ سُونا باب
پھر ہو گا آباد
یہ دیوارِ آب
کیسے ہو پایاب

جشنِ بہاریں حمد

مہر کی پہلی کرن اُس آنکھ پر آ کر پڑی
رنگ کچھ بدلا عجب اُس چشمِ غم نے اُس گھڑی

پرتوِ خورشید سے چمکے جھروکے شہر کے
پیپلوں کے باغ کے پتّے ہرے ہونے لگے

بے وفائی خواب کی دل سے جُدا ہوتی گئی
اک صدا مشرق کے میداں میں ہوا ہوتی گئی

شہیدِ کربلا کی یاد میں

خوابِ جمالِ عشق کی تعبیر ہے حسینؓ
شامِ ملالِ عشق کی تصویر ہے حسینؓ

جن گھروں سے ہم نے ہجرت کی

خانپور! — اے خانپور!

تیری گلیوں میں تھیں کیسی پیاری پیاری صورتیں
مسجدوں کے سبز در اور مندروں کی مورتیں

خانپور! — اے خانپور!

کُنڈ پانی کے پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپے
صوفیوں کی خانقاہیں تیری حد سے کچھ پرے

خانپور! — اے خانپور!

آم کے تاریک باغوں میں ہوا چلتی ہوئی
قوس اک رنگوں کی کوہ و دشت پر ڈھلتی ہوئی

خانپور! — اے خانپور!

تیرے چُپ دیوان خانوں میں بڑوں کے قہقہے
شادیوں کی محفلوں میں چشم ولب کے جمگھٹے

خانپور! — اے خانپور!

اپنے ہونے کی تسلی، تیرے ہونے کا خیال
مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ یہ کشش انگیز جال

خانپور! — اے خانپور!

اے ہلالِ عید

اے ہلالِ عید! تیرا حُسن وجہِ راحت و آرام ہے
اے نشانِ نُور تیری دید میرے صبر کا انعام ہے
دیکھتی ہے آنکھ تیرے روپ نیلے آسماں کے درمیاں
ہے بہت ہی دُور شہرِ خاک تجھ سے اے نگارِ زرفشاں

اے ہلالِ عید ——— !

تو جھلک ہے شام کی تنہائی میں گھرے طرب کی جانِ جاں
اے کمانِ رنگ تیرے تیر دِل میں گلستاں در گلستاں

اے ہلالِ عید ——— !

منزلِ دشتِ وفا میں خوابِ عشرت کی حسیں محراب تُو
اک دیارِ گم شدہ کے کاخ و کو کا اک سنہری باب تُو

اے ہلالِ عید ——— !

اپنے وطن پر سلام

اے وطن! اسلام کی اُمید گاہِ آخری، تجھ پر سلام
کُل جہاں کی تیرگی میں اے نظر کی روشنی، تجھ پر سلام

تُو ہُوا قائم خدا کی برتری کے نام پر
بازوے حیدرؓ، جمالِ احمدیؐ کے نام پر
مرگِ دانش کے جہاں میں لہلہاتی زندگی، تجھ پر سلام

تُو بھی ہے ہجرت کدہ شہرِ مدینہ کی طرح
ہم نے بھی دہرائی ہے اک رسمِ آبا کی طرح
اے جلالِ حق کے مظہر، اے نشانِ سرخوشی تجھ پہ سلام

میں ہوں فانی، حُسن تیرا مستقل
یاد رکھنا مجھ کو بھی اے شمعِ دل!
سایۂ افلاکِ نو میں اے بہارِ دائمی، تجھ پہ سلام

اپنے شہروں کے لیے دُعا

پاکستان کے سارے شہرو!
زندہ رہو! پائندہ رہو!
روشنیوں رنگوں کی لہرو!
زندہ رہو! پائندہ رہو!

عکس پڑیں جس جگہ تمہارے
چمکیں زمینیں ان کی ضیا سے
میرے وطن کے چاند ستارو!
زندہ رہو! پائندہ رہو!

موسم آئیں گزرتے جائیں
تم پر رنگ برستے جائیں
ارضِ خدا پہ مہکتے باغو!
زندہ رہو! پائندہ رہو!

باطل سے تم کبھی نہ ڈرنا
کُفر کبھی منظور نہ کرنا

عظمت و ہیبت کی دیوارو !
زندہ رہو ! پائندہ رہو !

حق کی رضا ہے ساتھ تمہارے
میری وفا ہے ساتھ تمہارے
نئے اُجالوں کے سرچشمو !
زندہ رہو ! پائندہ رہو !

اپنے شہر کے لیے دُعا

اے شہرِ بے مثال ! ترے بام و در کی خیر
اے حُسنِ لازوال ! ترے بام و در کی خیر

دیکھے ہیں تُو نے دَور بہت آسمان کے
بیتے ہیں تجھ پہ عہد بہت امتحان کے
اے قریۂ جلال ! ترے بام و در کی خیر
اک داستاں ہے ساتھ ترے رنگ و نور کی
یادیں ہیں تیرے ساتھ بہت دُور دُور کی
خوابِ شبِ جمال ! ترے بام در کی خیر

تسخیر تجھ کو کون کرے گا جہان میں
تُو ہے خدا اور اُس کے نبی کی امان میں
لاہورِ پُر کمال ! ترے بام و در کی خیر

ایک نیا شہر دیکھنے کی آرزو

ایک نگر ایسا بس جائے جس میں نفرت کہیں نہ ہو
آپس میں دھوکا کرنے کی، ظلم کی طاقت کہیں نہ ہو

اُس کے مکیں ہوں اور طرح کے، مسکن اور طرح کے ہوں
اُس کی ہوائیں اور طرح کی، گلشن اور طرح کے ہوں

شہر کو تو دیکھنے کو اک تماشہ چاہیئے

ہے یہ ان کی زندگی کے روگ کا کوئی علاج
ابتدا ہی سے ہے شاید شہر والوں کا مزاج
اپنے اعلیٰ آدمی کو قتل کرنے کا رواج

مارنے کے بعد اُس کو دیر تک روتے ہیں وہ
اپنے کردہ جُرم سے ایسے رہا ہوتے ہیں وہ

موسمِ سیرِ تنہائی میں آیندہ کا خیال

شام ہے، تنہا ہوا باغوں میں ہے
کال کوئل کی صداؤں سے شجر زاروں میں ہے

رفعتوں پہ جستجو اور ہجر کے نغموں کے دن
آنے والے موسموں کے اولیں خوابوں کے دن

اک عجب آئندہ کی تصویر کا رخ دو کُوہیں ہے
قریۂ ظلمت نشاں خوابِ جمالِ ہُو میں ہے

صبر کا ثمر

کئی طرح کے پھول تھے
رنگ و بُو کے خواب سے

بہت ہی جلد کھل گئے وہ
بہت ہی جلد مِٹ گئے

مگر اسی بہار میں
بہت ہی دیر سے کھلا
وہ پھول اک گلاب کا
جو دیر تک کھلا رہا

بدلتے موسم کی رات ہے

بدلتے موسم کی رات ہے
میدانوں میں اندھیرا ہے
وہ سامنے اونچی کرسی کے مکانوں کی نیم روشنی میں
دروازوں کے باہر کھڑے
لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟
سیاست کی؟ محبت کی؟ جنگ کی؟
اشیائے صرف کی گرانی کی؟
گزرے ہوئے دنوں کی؟
آنے والے ماہ و سال کی؟
کچھ پتہ نہیں چلتا
بس دُور سے ان کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے ہیں

ایک عالم سے دوسرے عالموں کا خیال

نیلا گرم سمندر
اوپر دھوپ کا شیشہ چمکے
موتی اس کے اندر

یاد آئی ہیں باتیں کتنی
بیٹھ کے اس ساحل پر
اک بے مقصد عمر کے قصے
بوجھ ہیں جو اب دل پر

کیا کیا منظر دیکھے میں نے
کیسی جگہوں میں گھوما
کیسے مکانوں میں دن کاٹے
کن لوگوں میں بیٹھا

یہ منظر بھی یاد آئے گا
اور کسی موسم میں
اور کسی دریا کے کنارے
اور کسی عالم میں

دوست ستارے کو چمکتے رہنے کا اشارہ

ستارے! مرے خوابِ اُمّید کے
سحر آنے والی ہو یا شامِ غم

اُفق ہو سفر کا کہ بامِ الم
ہو کشتِ ثمرور کہ ویراں چمن

نیا شہرِ امکاں کہ یادوں کا بن
ستارے مرے خوابِ اُمّید کے

اُس رخِ روشن کو دیکھنے کی تمنّا

کس کے لیے وہ گیت لکھوں ——
سارے عالم کے شہروں میں جس کی گونج سنائی دے
جس کو حُسن کرشمۂ جہاں کو خواب اک نیا دکھائی دے
کِس کے لیے وہ گیت لکھوں ——

آغازِ زمستاں میں دوبارہ

غروبِ مہر کا منظر گھڑی ہُوئی گزرا
بس ایک پل کو نیستاں اُسی طرح لرزا

گیاہِ سبز کی خوشبو اُسی زمانے کی
اُسی طرح کی مسرّت بہار آنے کی

وہی جمالِ در و سقف و بام ہے، میں ہوں
کنارِ رودِ سیہ فام شام ہے، میں ہوں

ایک بسر کیا ہوا منظر

مرے کمرے کے باہر شام جب ڈیرہ جماتی ہے
نگر کی مسجدوں سے گم اذاں کی گونج آتی ہے

شفق صحنِ مکاں میں رفتہ رفتہ مٹتی جاتی ہے
ہوا تاریک پتّوں میں خوشی سے سرسراتی ہے

ستارہ خاک کی دیوار کے اُوپر چمکتا ہے
کہ جس سے اُس طرف کا باغ اک میداں سا لگتا ہے

من و تو کی حدوں پر اداسی

خیال اتنے ہیں دل میں سمجھ نہیں آتے
سمجھ بھی آئیں اگر تو کہے نہیں جاتے

وہ سامنے بھی جو ہوتا تو اس سے کیا کہتے
بس اُس کی باتیں ہی سُنتے ہم اور چُپ رہتے

چمن کا زور فصیلوں کی انتہا تک ہے
یہ شورِ برگِ بہاراں کا بس ہوا تک ہے

ساکت تصویروں کا باطن

اِک موسم میں سارے بنجر بنجر سے لگتے ہیں
پھر بھی اندر ہرا ہے ان کا یوں اُوپر سے لگتے ہیں
جیسے اچانک کبھی کھنڈر آباد نگر سے لگتے ہیں

دل ہیبت سے بھرے ہوئے اور چہرے ان کے خالی ہیں
جو کچھ ہے باطن میں ہے اور ظاہر جن کے خالی ہیں
آنکھ جمی ہے ان چہروں پہ سارے عہد کے لوگوں کی
جیسے انہی کے پاس دوا ہے ان کے سارے روگوں کی

خاکی رنگ کی پریشانی میں خواب

کھڑکی کے باہر سبز جھروکا اس کے پیچھے چاند ہے
جس کی صاف کشش کے آگے رنگ زمیں کا ماند ہے

تیز ضیا چہروں پر آئی کیسے بندھن توڑ کے
کیسی دُور دراز جگہوں کے دل کش منظر چھوڑ کے

مٹتے بنتے نقش ہزاروں، گھٹتی بڑھتی دُوریاں
ایک طرف پر وصل کا قصّہ، تین طرف مجبوریاں

بارشوں کا موسم ہے

بارشوں کا موسم ہے
کوئلوں کی کُوکُو ہے
آم کے درختوں کی
سبز، تیز خوشبو ہے

بے مثال تنہائی
بے کنار میداں کی
اک جھلک کہیں اس میں
آبِ بحرِ حیواں کی

اس کو یاد ہے جیسے
بات اُس زمانے کی
دھوم اس کے دل میں ہے
ان دنوں کے آنے کی

ایک منزل پر ایک دُعا

پھرتی ہوئی بے چین ہواؤ
میری مدد کو آؤ
اُڑتی ہوئی ھم درد صداؤ!
میری مدد کو آؤ!!
آؤ مِل کر اس دُنیا کو جنّت کی تصویر بنا دیں
امن اور حُسن کا خواب مسرّت آدم کی تقدیر بنا دیں
یہ اک کام ہے جس میں آکر میرا ہاتھ بٹاؤ

پھرتی ہوئی بے چین ہواؤ!
اڑتی ہوئی ھم درد صداؤ!!

جنگ کے سائے میں جنتِ ارضی کا خواب

کبھی جامن کی شاخوں میں

کبھی فرشِ زمرّد پر

یہ گُندم گا رہی ہے راگنی عہدِ محبّت کی

کھلی، چٹیل زمینوں سے

غبارِ شام میں اُڑتی

صدائیں گھر کو واپس آ رہے مسرور لوگوں کی

اُفق تک کھیت سرسوں کے

گلاب اور سبز گندم کے

حویلی کے شجر پر شور چڑیوں کے چہکنے کا

عجب حیرانیاں سی ہیں

مکانوں اور مکینوں میں

کہ موسم آ رہا ہے گاؤں کے جنگل مہکنے کا

حیرت کی منزل پر حسن کی نشانیاں

جیسے بارش ابھی ابھی تھمی ہے
ہوا ایسی ہے
کہیں کہیں سے، کبھی کبھی کسی کوئل کا نغمۂ مہجوری
شامِ بہار دروازے پر دستک دے رہی ہے
نئے نئے نکلے ستاروں
اور چاند کی چکا چوند میں اُلجھی ہوئی یہ شام بھی عجیب ہے

دشمن کی طرف دوستی کا ہاتھ

میرے جسم میں زہر ہے تیرا
میرا دل ہے تیرا گھر

تُو موجود ہے ساتھ ہمیشہ
خوف سا بن کر شام و سحر

تیرا اثر ہے میرے لہو پر
جیسے چاند سمندر پر

اِتنی زرد ہے رنگت تیری
جم جاتی ہے اُس پہ نظر

تُو ہے سزا میرے ہونے کی
یا ہے میرا زادِ سفر

کرے گا تُو بیمار مجھے، یا
بنے گا نامعلوم کا ڈر

رہے گا دائم گہری تہہ میں
جیسے اندھیرے میں کوئی در

گُم کر دے گا راہ میں مجھ کو
یا دے گا منزل کی خبر

تُو ہے میرا دوست کہ دشمن
یہ تو بتا مجھ کو اے زرا

سفر کے طلسمات

اک بڑا، خاکستری میدان تھا پھیلا ہُوا
دُور تک کچھ بھی نہ تھا ویراں درختوں کے سوا
یا پُرانا سا کھنڈر اک پیپلوں کے باغ کا

رات سر پہ آگئی اور میں ابھی رستے میں تھا
پھر ہوا چلنے لگی اور مَیں ابھی رستے میں تھا

نیا سال

نیا سال آیا ہے

ویران صُبحوں کی نیلی تہوں سے اُبھرتا

خیابان و دشت و جبل کی ٹھٹھرتی خموشی میں برفیلی سیٹی بجاتا ،

دبے پاؤں آیا

یخ آلود شاموں کی خاموشیاں

اس کے قدموں کی آہٹ سمیٹے

گزرگاہوں پر، سائبانوں میں نوحہ کناں ہیں

در آتی ہے شب کو دریچوں کی درزوں سے

پُر شور جھونکوں کی بے مہر ٹھنڈک

برودت زدہ پانیوں پر، پرندے

کناروں پہ استادہ پیڑوں کی نمناک شاخوں کی جانب اڑے جا رہے ہیں

مکیں آنگنوں میں، چھتوں پر

دھڑکتے دلوں میں ہزاروں خیالوں کی شمعیں جلائے

دبے پاؤں آتے ہوئے سال کو دیکھتے ہیں

رنگ رنگیلے پنکھوں والے پنچھی ہوتے

رنگ رنگیلے پنکھوں والے پنچھی ہوتے

جب ساون کا مہینہ آتا

کالی گھور گھٹائیں لاتا

بوندوں کے سنگ راس رچاتے

ڈال ڈال پر شور مچاتے

ہرے ہرے پتّوں میں سوتے

رنگ رنگیلے پنکھوں والے پنچھی ہوتے

پھر پھولوں کی رُت آ جاتی

سارے جگ میں رنگ جماتی

کلی کلی سے نَین ملاتے

پھُولوں کا مُکھ چُومنے جاتے

خوشبوؤں میں سُدھ بُدھ کھوتے

پھر اک ایسی رُت بھی ہوتی

بجھتے لگتی جیون جوتی

ٹھنڈی ہواؤں میں اُڑ جاتے
کسی جتن سے ہاتھ نہ آتے
دُور دیس میں بیٹھ کے روتے
رنگ رنگیلے پنکھوں والے پنچھی ہوتے

اگر میں راہ رو ہوتا

یہ کیسا راگ ہے یارو! جو دشت و در سے اُٹھا ہے
یہ جن جن بستیوں کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے
اُنھیں تاراج کرتا اور آگے اور آگے بڑھتا جاتا ہے
اگر میں راہ رو ہوتا تو اس کے ساتھ جاتا میں
میں اپنی آنکھ سے بربادیوں کے وہ مناظر دیکھتا
اور آہ بھرتا میں ——————

مَیں بھی ہُوں اپنے ایک خواب میں مست

کوئی ہے شیشہ و شراب میں مست
کوئی ہے لذّتِ شباب میں مست
مبتلا ہیں سبھی کہیں نہ کہیں
مَیں بھی ہوں اپنے ایک خواب میں مست

ناحق اس ظالم سے ملنے ہم بھی اتنی دُور گئے

اِدھر اُدھر کی لاکھوں باتیں
اصل جو تھی وہی بات نہ کی
بہت فسانے دنیا بھر کے
اصل کہانی یاد نہ تھی
وُہی شناسا آنکھیں، جن میں
میری کوئی پہچان نہ تھی
وُہی گلابی ہونٹ تھے، جن پر
میرے لیے مُسکان نہ تھی
اس کے بعد بہت دن ٹھہرا
اُس اَن جانی بستی میں
بہت دنوں تک خاک اُڑائی
اُس میدانِ ہستی میں
اُس کے سوا بھی لوگ بہت تھے
حُسن کے جلوے اور بھی تھے
وُہ بھی ہم سے نہیں مِلا پھر
ہم بھی اس سے نہیں ملے

غزل

خمارِ شب میں اُسے مَیں سلام کر بیٹھا
جو کام کرنا تھا مجھ کو، وہ کام کر بیٹھا

قبائے زرد پہن کر وُہ بزم میں آیا
گُلِ حنا کو ہتھیلی میں تھام کر بیٹھا

چھپا گیا تھا محبّت کا راز مَیں تو، مگر
وہ بھولپن میں سخن دل کا عام کر بیٹھا

جو سو کے اُٹھا تو رستہ اُجاڑ لگتا تھا
پہنچنا تھا مجھے منزل پہ، شام کر بیٹھا

تھکن سفر کی بدن شل سا کر گئی ہے منیرؔ
بُرا کیا جو سفر میں قیام کر بیٹھا

غزل

امتحاں ہم نے دیے اس دارِ فانی میں بہت
رنج کھینچے ہم نے اپنی لامکانی میں بہت

وہ نہیں اُس سا تو ہے خوابِ بہارِ جاوداں
اصل کی خوشبو اُڑی ہے اس کے ثانی میں بہت

رات دن کے آنے جانے میں یہ سونا جاگنا
فکر والوں کو پتے ہیں اس نشانی میں بہت

کوئلیں کُوکیں بہت دیوارِ گلشن کی طرف
چاند دمکا حوض کے شفّاف پانی میں بہت

اس کو کیا، یادیں تھیں کیا اور کس جگہ پر رہ گئیں
تیز ہے دریائے دل اپنی روانی میں بہت

آج اُس محفل میں تجھ کو بولتے دیکھا منیرؔ
تُو کہ جو مشہور تھا یوں بے زبانی میں بہت

غزل

اک مسافت پاؤں شل کرتی ہوئی سی خواب میں
اک سفر گہرا مسلسل زردیٔ مہتاب میں

تیز ہے بُوئے شگوفہ ہائے مرگِ ناگہاں
گھر گئی خاکِ زمیں جیسے حصارِ آب میں

حاصلِ جہدِ مسلسل مستقل آزردگی
کام کرتا ہوں ہوا میں جستجو نایاب میں

تنگ کرتی ہے مکاں میں خواہشِ سیرِ بسیط
ہے اثر دائم فلک کا صحن کی محراب میں

اے منیرؔ اب اس قدر خاموشیاں یہ کیا ہوا!
یہ صفت آئی کہاں سے پارۂ سیماب میں

غزل

یہ آنکھ کیوں ہے یہ ہاتھ کیا ہے
یہ دن ہے کیا چیز رات کیا ہے

فراقِ خورشید و ماہ کیوں ہے
یہ اُن کا اور میرا ساتھ کیا ہے

گماں ہے کیا اس صنم کدے پر
خیالِ مرگ و حیات کیا ہے

فغاں ہے کس کے لیے دلوں میں
خروشِ دریائے ذات کیا ہے

فلک ہے کیوں قیدِ مستقل میں
زمیں پہ حرفِ نجات کیا ہے

ہے کون کس کے لیے پریشاں
پتہ تو دے اصل بات کیا ہے

ہے لمس کیوں رائگاں ہمیشہ
فنا میں خوفِ ثبات کیا ہے

منیر اس شہرِ غم زدہ پر
ترا یہ سحرِ نشاط کیا ہے

غزل

رہتا ہے اک ہراس سا قدموں کے ساتھ ساتھ
چلتا ہے دشت، دشت نوردوں کے ساتھ ساتھ

ہاتھوں کا ربط حرفِ خفی سے عجیب ہے
ہلتے ہیں ہاتھ راز کی باتوں کے ساتھ ساتھ

اُٹھتی ہُوئی فصیلِ فغاں حدِّ شہر پر
گلیوں کی چُپ قدیم مکانوں کے ساتھ ساتھ

سورج کی آب زہر ہے رنگوں کی آب کو
ہے دُور تک بخار سا باغوں کے ساتھ ساتھ

عُریاں ہُوا ہے ماہ، شبِ ابر و باد میں
جیسے سفید روشنی غاروں کے ساتھ ساتھ

آیا ہوں میں منیرؔ کسی کام کے لیے
رہتا ہے اک خیال سا خوابوں کے ساتھ ساتھ

غزل

غیروں سے مل کے ہی سہی، بے باک تو ہُوا
بارے وہ شوخ پہلے سے چالاک تو ہُوا

جی خوش ہُوا ہے گرتے مکانوں کو دیکھ کر
یہ شہر خوفِ خود سے جگر چاک تو ہُوا

یہ تو ہُوا کہ آدمی پہنچا ہے ماہ تک
کچُھ بھی ہُوا، وہ واقفِ افلاک تو ہُوا

کچھ اور وہ ہُوا نہ ہوا مجھ کو دیکھ کر
یادِ بہارِ حسن سے غم ناک تو ہُوا

اس کشمکش میں ہم بھی تھکے تو ہیں اے منیرؔ
شہرِ خدا ستم سے مگر پاک تو ہُوا

غزل

سارے منظر ایک جیسے، ساری باتیں ایک سی
سارے دن ہیں ایک سے اور ساری راتیں ایک سی

بے نتیجہ بے ثمر جنگ و جدل سُود و زیاں
ساری جیتیں ایک جیسی، ساری ماتیں ایک سی

سب ملاقاتوں کا مقصد کاروبارِ زرگری
سب کی دہشت ایک جیسی، سب کی گھاتیں ایک سی

اب کسی میں اگلے وقتوں کی وفا باقی نہیں
سب قبیلے ایک ہیں اب، ساری ذاتیں ایک سی

ایک ہی رُخ کی اسیری خواب ہے شہروں کا اب
ان کے ماتم ایک سے، ان کی براتیں ایک سی

ہوں اگر زیرِ زمیں تو فائدہ ہونے کا کیا
سنگ و گوہر ایک ہیں پھر ساری دھاتیں ایک سی

اے منیرؔ! آزاد ہو اس سحر یک رنگی سے تُو
ہو گئے سب زہر یکساں، سب نباتیں ایک سی

غزل

اسیرِ خواہشِ قیدِ مقام تُو ہے کہ مَیں
نظامِ شمس و قمر کا غلام تو ہے کہ مَیں

ہے کون دونوں میں ظاہر ہے کون پردے میں
چُھپا ہُوا ہے جو نظروں سے دام، تُو ہے کہ مَیں

نمائشِ مہِ کامل پہ کس کا سایہ ہے
یہ اس کے چار طرف ابرِ شام تُو ہے کہ مَیں

اُڑا ہے رنگِ در و بام باد و باراں سے
نگر کی اس گھنی چُپ میں مدام تُو ہے کہ مَیں

مکانِ دُور سے آتی ہے اک صدا سی منیرؔ
بُھلا دیا جسے سب نے وہ نام تُو ہے کہ مَیں

غزل

نگر میں شام ہو گئی ہے کاہشِ معاش میں
زمیں پہ پھر رہے ہیں لوگ رزق کی تلاش میں

گزر گئی تمام عمر اس حصارِ تنگ میں
کشش ہے اک مریض سی مکاں کی بود و باش میں

ہلال حرفِ خوف سا فصیلِ سنگِ نیل پر
ہے یا عدم کا زرد رنگ خواہشِ خراش میں

چمک رہے ہیں تعزیے بلا کی تیز دھوپ میں
مہک ہے آبِ مرگ کی فشارِ عرق پاش میں

منیرؔ حسنِ باطنی کو کوئی دیکھتا نہیں
متاعِ چشم کھو گئی لباس کی تراش میں

غزل

ابھی مجھے اک دشتِ صدا کی ویرانی سے گزرنا ہے
ایک مسافت ختم ہوئی ہے، ایک سفر ابھی کرنا ہے

گری ہُوئی دیواروں میں جکڑے سے ہُوئے دروازوں کی
خاکستر سی دہلیزوں پر سرد ہوا نے ڈرنا ہے

ڈر جانا ہے دشت و جبل نے تنہائی کی ہیبت سے
آدھی رات کو جب مہتاب نے تاریکی سے اُبھرنا ہے

یہ تو ابھی آغاز ہے جیسے اُس پہنائے حیرت کا
آنکھ نے اور سنور جانا ہے رنگ نے اور نکھرنا ہے

جیسے زر کی پیلاہٹ میں موجِ خون اُترتی ہے
زہرِ زر کے تند نشے نے دیدہ و دل میں اُترنا ہے

غزل

تھکے لوگوں کو مجبوری میں چلتے دیکھ لیتا ہوں
میں بس کی کھڑکیوں سے یہ تماشے دیکھ لیتا ہوں

کبھی دل میں اُداسی ہو تو اُن میں جا نکلتا ہوں
پرانے دوستوں کو چُپ سے بیٹھے دیکھ لیتا ہوں

چُھپاتے ہیں بہت وہ گرمیٔ دل کو، مگر مَیں بھی
گُلِ رُخ پر اُڑی رنگت کے چھینٹے دیکھ لیتا ہوں

کھڑا ہوں یوں کسی خالی قلعے کے صحنِ ویراں میں
کہ جیسے مَیں زمینوں میں دفینے دیکھ لیتا ہوں

منیرؔ اندازۂ قعرِ فنا کرنا ہو جب مجھ کو
کسی اونچی جگہ سے جُھک کے نیچے دیکھ لیتا ہوں

غزل

شام کے مسکن میں ویراں میکدے کا در کھُلا
بابِ گزری صحبتوں کا خواب کے اندر کھُلا

کچھ نہ تھا جز خوابِ وحشت وہ وفا اُس عہد کی
راز اتنی دیر کا اِس عُمر میں آ کر کھُلا

جگمگا اُٹھا اندھیرے میں مری آہٹ سے وُہ
یہ عجب اُس بُت کا میری آنکھ پہ جوہر کھُلا

بن میں سرگوشی ہُوئی آثارِ ابر و باد سے
بندِ غم سے جیسے اک اشجار کا لشکر کھُلا

سبزۂ نو رستہ کی خوشبو تھی ساحل پر منیرؔ!
بادلوں کا رنگ چھتری کی طرح سر پر کھُلا

غزل

پڑے عکس آ کر نظر پر کئی
دیا ایک تھا، اس کے منظر کئی

کھلا تہ بہ تہ نیل گوں آسماں
مکاں ایک تھا، اس کے اندر کئی

بہت دور جا کر ملا وہ مجھے
کہ در ایک تھا اور پس در کئی

کئی رنگ پیدا ہوئے برق سے
پڑے عکس دیوار و در پر کئی

اٹھا معبدوں سے اگر کا دھواں
ہوئے باغ اس سے معنبر کئی

ہوا شام کی آہِ آوارہ تھی
ملے اس سے غم کے سمندر کئی

بہت خاک اُڑنے لگی ہر طرف
کہ جیسے سفر میں ہوں لشکر کئی

سخن ایسا کس نے کیا شہر میں
نگر میں تھے یوں تو سخنور کئی

منیرؔ ان دنوں سے پریشاں نہ ہو
کہ دن ان سے گزرے ہیں ابتر کئی

غزل

نیلِ فلک کے اسم میں نقشِ اسیر کے سبب
حُسن ہے آب و خاک میں ماہِ منیر کے سبب

وسعتِ شہرِ تنگ دل سرما کی صُبحِ سرد میں
جاگی ہے ڈر کے خواب سے صوتِ فقیر کے سبب

سہمِ مکاں میں بند ہے دستِ دعائے آگہی
دل میں ہے شوق بے حساب حد کی لکیر کے سبب

زخمِ وجود کی دوا بس وہی آخری صدا
زندہ ہوں جس کے شوق میں صبرِ کبیر کے سبب

سحر ہے موت میں منیرؔ جیسے ہے سحرِ آئینہ
ساری کشش ہے چیز میں اپنی نظیر کے سبب

غزل

سفر میں ہے جو ازل سے یہ وہ بلا ہی نہ ہو
کواڑ کھول کے دیکھو، کہیں ہوا ہی نہ ہو

نگاہِ آئینہ معلوم، عکس نا معلوم
دکھائی دیتا ہے جو اصل میں چھپا ہی نہ ہو

زمیں کے گرد بھی پانی، زمیں کی تہ میں بھی
یہ شہر جم کے کھڑا ہے جو تیرتا ہی نہ ہو

نہ جا کہ اس سے پرے دشتِ مرگ ہو شاید
پلٹنا چاہیں وہاں سے تو راستہ ہی نہ ہو

میں اس خیال سے جاتا نہیں وطن کی طرف
کہ مجھ کو دیکھ کے اُس بُت کا جی بُرا ہی نہ ہو

کٹی ہے جس کے خیالوں میں عُمر اپنی منیرؔ
مزا تو جب ہے کہ اس شوخ کو پتا ہی نہ ہو

غزل

نشیبِ وہم، فرازِ گریز پا کے لیے
حصارِ خاک ہے حد پر ہر انتہا کے لیے

وفورِ نشہ سے رنگت سیاہ سی ہے مری
جلا ہوں میں بھی عجب چشمِ سرمہ سا کے لیے

ہے ارد گرد گھنا بن ہرے درختوں کا
کھُلا ہے در کسی دیوار میں ہوا کے لیے

زمیں ہے مسکنِ شر، آسماں سراب آلود
ہے سارا عہد سزا میں کسی خطا کے لیے

اسیری پسِ آئینۂ بقا اور تُو
نکل کے آ بھی وہاں سے کبھی خدا کے لیے

کھڑا ہوں زیرِ فلکِ گنبدِ صدا میں منیرؔ
کہ جیسے ہاتھ اُٹھا ہو کوئی دُعا کے لیے

غزل

کیسی کیسی بے ثمر یادوں کے ہالوں میں رہے
ہم بھی اپنی زندگی کیسے وبالوں میں رہے

اک نظر بندی کا عالم تھی نگر کی زندگی
قید میں رہتے تھے جب تک شہر والوں میں رہے

ہم اگر ہوتے تو ملتے تجھ سے بھی جانِ جہاں
خواب تھے، ناپید دُنیا کے ملالوں میں رہے

وہ چمکنا برق کا دشت و در و دیوار پر
سارے منظر ایک پل اس کے اُجالوں میں رہے

کیا تھیں وُہ باتیں جو کہنا چاہتے تھے وقتِ مرگ
آخری دم یار اپنے کِن خیالوں میں رہے

دُور تک مسکن تھے بن اُن کی صداؤں کے منیرؔ
دیر تک اُن ناریوں کے غم شوالوں میں رہے

غزل

آئینہ اب جُدا نہیں کرتا
قید میں ہُوں، رِہا نہیں کرتا

مستقل صبر میں ہے کوہِ گراں
نقشِ عبرت صدا نہیں کرتا

رنگِ محفل بدلتا رہتا ہے
رنگ کوئی وفا نہیں کرتا

عیشِ دُنیا کی جستجو مت کر
یہ دفینہ مِلا نہیں کرتا

جی میں آئے جو کر گزرتا ہے
تُو کسی کا کہا نہیں کرتا

ایک وارث ہمیشہ ہوتا ہے
تخت خالی رہا نہیں کرتا

عہدِ انصاف آ رہا ہے منیرؔ
ظلم دائم ہُوا نہیں کرتا

غزل

چاند نکلا ہے سرِ قریۂ ظلمت دیکھو
ہو گئی کیسی سیہ خانوں کی رنگت دیکھو

سامنے جو ہے اُسے آنکھ کا دھوکا سمجھو
ان دیاروں کو سدا خواب کی صورت دیکھو

سیر ہے جیسے کوئی، ایسے جہاں سے گزرو
دُور تک پھیلا ہے اک عرصۂ فرقت دیکھو

خوف دیتا ہے یہاں ابر میں تنہا ہونا
شہرِ دربند میں دیواروں کی کثرت دیکھو

زر کی پرچھائیں جو پڑتی ہے چمک اُٹھتا ہے
آدمِ خاک کی بے ہوشی میں حالت دیکھو

سایہ ہے ان پہ بہت بھُولی ہُوئی یادوں کا
شام آئی ہے پری زادوں میں وحشت دیکھو

داغ ہے اُس کے نہ ہونے سے دلوں میں ابتک
اُڑ گیا مثلِ صبا، گل کی حقیقت دیکھو

جنگلوں میں کوئی پیچھے سے بلائے تو منیرؔ
مڑ کے رستے میں کبھی اُس کی طرف مت دیکھو

غزل

مَیں سُن رہا ہوں اُسے، جو سُنائی دیتا نہیں
میں دیکھتا ہوں اسے، جو دکھائی دیتا نہیں

بہت قیام کی خواہش سفر میں آتی ہے
طلسمِ شامِ غریباں رہائی دیتا نہیں

ہے شوقِ انجمن آرائی حُسن کو بھی، مگر
مجال اس کو غمِ رونمائی دیتا نہیں

وصالِ ارض و سما کا سماں ہے جیسے کوئی
اندھیرا اِتنا ہُوا، کچھ سجھائی دیتا نہیں

منیرؔ کھول دے بڑھ کر درِ دیارِ ندا
خموش رہتا ہے کیوں اب دہائی دیتا نہیں

غزل

اور ہیں کتنی منزلیں باقی
جان کتنی ہے جسم میں باقی

زندہ لوگوں کی بود و باش میں ہیں
مُردہ لوگوں کی عادتیں باقی

اُس سے ملنا وُہ خوابِ ہستی میں
خواب معدوم حسرتیں باقی

بہہ گئے رنگ و نور کے چشمے
رہ گئیں اُن کی رنگتیں باقی

جن کے ہونے سے ہم بھی ہیں اے دل!
شہر میں ہیں وہ صورتیں باقی

وہ تو آ کے منیرؔ! جا بھی چُکا
اک مہک سی ہے باغ میں باقی

"

غزل

کوئی حد نہیں ہے کمال کی
کوئی حد نہیں ہے جمال کی

وہی قُرب و دُور کی منزلیں
وہی شام خواب و خیال کی

نہ مجھے ہی اس کا پتہ کوئی
نہ اسے خبر مرے حال کی

یہ جواب میری صدا کا ہے
کہ صدا ہے اُس کے سوال کی

یہ نمازِ عصر کا وقت ہے
یہ گھڑی ہے دن کے زوال کی

وہ قیامتیں جو گزر گئیں
تھی امانتیں کئی سال کی

ہے منیرؔ تیری نگاہ میں
کوئی بات گہرے ملال کی

غزل

یہ کیسا نشہ ہے، میں کس عجب خمار میں ہوں
تو آ کے جا بھی چکا ہے، میں انتظار میں ہوں

مکاں ہے قبر، جسے لوگ خود بناتے ہیں
میں اپنے گھر میں ہوں یا میں کسی مزار میں ہوں

درِ فصیل کھلا، یا پہاڑ سر سے ہٹا
میں اب گری ہوئی گلیوں کے مرگ زار میں ہوں

بس اتنا ہوش ہے مجھ کو کہ اجنبی ہیں سب
رکا ہوا ہوں سفر میں، کسی دیار میں ہوں

میں ہوں بھی اور نہیں بھی، عجیب بات ہے یہ
یہ کیسا جبر ہے میں جس کے اختیار میں ہوں

منیرؔ دیکھ شجر، چاند اور دیواریں
ہوا خزاں کی ہے سر پر، شبِ بہار میں ہوں

غزل

آ گئی یادِ شام ڈھلتے ہی
بُجھ گیا دل چراغ جلتے ہی

کھُل گئے شہرِ غم کے دروازے
اک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی

کون تھا تُو کہ پھر نہ دیکھا تجھے
مِٹ گیا خواب آنکھ مَلتے ہی

خوف آتا ہے اپنے ہی گھر سے
ماہِ شب تاب کے نکلتے ہی

تُو بھی جیسے بدل سا جاتا ہے
عکسِ دیوار کے بدلتے ہی

خون سا لگ گیا ہے ہاتھوں میں
چڑھ گیا زہر گُل مسلتے ہی

غزل

بارشوں میں اُس سے جا کے ملنے کی حسرت کہاں
کُڑکنے دو کوئلوں کو، اب مجھے فرصت کہاں

جی تو کہتا ہے کہ اس کو ساتھ ہی رکھّیں مگر
اپنے پاس اُس حُسنِ عیش انگیز کی قیمت کہاں

تلخ اس کو کر دیا اربابِ قریہ نے بہت
ورنہ اک شاعر کے دل میں اس قدر نفرت کہاں

روک سکتے تھے اسے ہم ابتدا کے دَور میں
اب ہمیں دیوانگیِ شہر پہ قدرت کہاں

دیکھتا ہوں ہر طرف، شائد دکھائی دے کبھی
پُر فراخ دشت میں آدم کی وہ صورت کہاں

ایک منزل یہ بھی تھی خوابوں کی ورنہ اے منیر
میں کہاں اور اس دیارِ غیر کی غربت کہاں

غزل

مثالِ سنگ کھڑا ہے اُسی حسیں کی طرح
مکاں کی شکل بھی دیکھو دلِ مکیں کی طرح

ملائمت ہے اندھیرے میں اُس کی سانسوں سے
دمک رہی ہیں وہ آنکھیں ہرے نگیں کی طرح

نواحِ قریہ ہے سنسان شامِ سرما میں
کسی قدیم زمانے کی سرزمیں کی طرح

زمیں دُور سے تارہ دکھائی دیتی ہے
رُکا ہے اس پہ قمر چشمِ سیر بیں کی طرح

فریب دیتی ہے وسعت نظر کی اُفقوں پہ
ہے کوئی چیز، یہاں سحرِ نیلمیں کی طرح

منیر عہد ہے اب آخری مسافت کا
کہ چل رہی ہے ہوا بادِ واپسیں کی طرح

غزل

ڈر کے کسی سے چھپ جاتا ہے جیسے سانپ خزانے میں
زر کے زور سے زندہ ہیں سب خاک کے اس ویرانے میں

جیسے رسم ادا کرتے ہوں شہروں کی آبادی میں
صبح کو گھر سے دور نکل کر شام کو واپس آنے میں

نیلے رنگ میں ڈوبی آنکھیں کھلی پڑی تھیں سبزے پہ
عکس پڑا تھا آسمان کا شاید اس پیمانے میں

دبی ہوئی ہے زیر زمیں اک دہشت گنگ صداؤں کی
بجلی سی کہیں لرز رہی ہے کسی چھپے تہ خانے میں

دل کچھ اور بھی سرد ہوا ہے شامِ شہر کی رونق سے
کتنی ضیا بے سود گئی ہے شیشے کے لفظ جلانے میں

میں تو منیرؔ آئینے میں خود کو تک کر حیران ہوا
یہ چہرہ کچھ اور طرح تھا پہلے کسی زمانے میں

غزل

شہر، پربت، بحر و بر کو چھوڑتا جاتا ہوں میں
اک تماشا ہو رہا ہے، دیکھتا جاتا ہوں میں

ہوش اُڑتا جا رہا ہے گرمیٔ رفتار میں
دیکھتا جاتا ہوں میں اور بھولتا جاتا ہوں میں

ابر ہے افلاک پر اور اک سراسیمہ قمر
ایک دشتِ رائیگاں میں دوڑتا جاتا ہوں میں

ہوں مکاں میں بند، جیسے امتحاں میں آدمی
سختیٔ دیوار و در ہے، جھیلتا جاتا ہوں میں

شوق ہیں کچھ جن کے پیچھے چل رہا ہوں میں منیر
رنج ہیں کچھ دل میں میرے، کھینچتا جاتا ہوں میں

غزل

ایک میں اور اتنے لاکھوں سلسلوں کے سامنے
ایک صوتِ گنگ جیسے گنبدوں کے سامنے

مٹتے جاتے نقش دودِ دم کی آمد رفت سے
کھلتے جاتے ہیں صد الب آئینوں کے سامنے

ہے ہوائے سیر آب اور اجنبی سی سرزمیں
اُڑ رہی ہے خاک، کہنہ ساحلوں کے سامنے

آگ جلتی ہے گھروں میں یا کوئی تصویر ہے
یادگارِ جرمِ آدم خاکیوں کے سامنے

دشمنی رسمِ جہاں ہے، دوستی حرفِ غلط
آدمی تنہا کھڑا ہے ظالموں کے سامنے

چار چُپ چیزیں ہیں: بحر و بر، فلک اور کوہسار
دل دہل جاتا ہے ان خالی جگہوں کے سامنے

باطنِ زردار پُر اسرار ہے، جیسے منیرؔ
کانِ زر کی بند ہیبت مشعلوں کے سامنے

غزل

ڈرے ہوؤں کو مگر اعتبار کس کا تھا
تمام عمر ہمیں انتظار کس کا تھا

اُڑا غبار ہوا سے تو راہ خالی تھی
وہ کون شخص تھا اس میں، غبار کس کا تھا

لیے پھرا جو مجھے در بدر زمانے میں
خیال تجھ کو دلِ بے قرار! کس کا تھا

روش سے ہٹ کے بنے اک مکانِ نو کے قریب
وہ خوں تھا کس کا، وہ پھولوں کا ہار کس کا تھا

یہ جبرِ مرگِ مسلسل ہی زندگی ہے منیرؔ
جہاں میں اس پہ کبھی اختیار کس کا تھا

غزل

سحر کے وقت یہ کیا میں نے خواب سا دیکھا
سفید ابر ہرے رنگ میں گھرا دیکھا

بس ایک پل کا تماشا کنارِ صحرا پر
پھر اس کے بعد اسے دشت میں ہوا دیکھا

قدیم قریوں میں موجود تُو خدائے قدیم
جدید شہروں میں بھی تجھ کو رونما دیکھا

منیرؔ شہرِ محمد میں جا کے دیکھیں ذرا
بلادِ کُفر میں خود کو بہت گنوا دیکھا

غزل

شانِ ہنر، کلامِ سخن ور بھی کچھ نہیں
عجزِ فقیر و کبرِ تونگر بھی کچھ نہیں

بنیاد کچھ نہیں ہے کسی شے کی اس جگہ
اس شہر میں بہائے سکندر بھی کچھ نہیں

رشتہ روایتوں سے بھی باقی نہیں رہا
آئندہ کے سفر کے افق پر بھی کچھ نہیں

شامِ فراقِ یار وہی، دشت و در وہی
دریائے غم کے پار کا منظر بھی کچھ نہیں

لاحاصلی ہی شہر کی تقدیر ہے منیرؔ
باہر بھی گھر سے کچھ نہیں، اندر بھی کچھ نہیں

غزل

تھکن سے راہ میں چلنا محال بھی ہے مجھے
کمال پر بھی تھا مَیں ہی، زوال بھی ہے مجھے

سڑک پہ چلتے ہوئے رُک کے دیکھتا ہوں مَیں
یہیں کہیں ہے تو، یہ احتمال بھی ہے مجھے

یہ میرے گرد تماشا ہے آنکھ کھُلنے تک
مَیں خواب میں تو ہُوں لیکن خیال بھی ہے مجھے

اُسی کے لطف سے مرنے سے خوف آتا ہے
اُسی کے ڈر سے یہ جینا محال بھی ہے مجھے

سوادِ شامِ سفر ہے جلا جلا سا منیرؔ
خوشی کے ساتھ عجب سا ملال بھی ہے مجھے

غزل

آئی ہے اب یاد کیا رات اک بیتے سال کی
یہی ہوا تھی باغ میں، یہی صدا گھڑیال کی

مہک عجب سی ہو گئی پڑے پڑے صندوق میں
رنگت پھیکی پڑ گئی ریشم کے رومال کی

شہر میں ڈر تھا موت کا، چاند کی چوتھی رات کو
اینٹوں کی اس کھوہ میں دہشت تھی بھونچال کی

شام جھکی تھی بحر پہ، پاگل ہو کر رنگ سے
یا تصویر تھی خواب میں، میرے کسی خیال کی

عمر کے ساتھ عجیب سا بن جاتا ہے آدمی
حالت دیکھ کے دکھ ہوا، آج اس پری جمال کی

دیکھ کے مجھ کو غور سے پھر وہ چپ سے ہو گئے
دل میں خلش ہے آج تک اس ان کہے سوال کی

غزل

خوش ہے جیسے اب رہا ہو کر پرانے بار سے
ارض تیرہ ہو چلی تھی کثرتِ اشجار سے

شہر ہیں دیوانگی دیدارِ ماہ نو سے ہے
منظروں پہ رنگ سا ہے شام کے آثار سے

ہے مثالِ سنگ، دل اس نرگسِ بیمار کا
ہے بخار آنکھوں میں اُس کی حُسن کے آزار سے

وہ صدا میری خلائے کوہ و دشت و بحر میں
خوف وہ قیدِ صدا کا حرف کی تکرار سے

ایک محرابِ آسماں کی درمیانِ بام و در
اک دیے کی لَو نمایاں روزنِ دیوار سے

ہو گئے اُس سے جُدا بس سوچ کر کچھ جی میں ہم
بات کیا ہم نے نکالی خامشیِ یار سے

تابشِ خورشید میرے جسم میں ہے اے منیرؔ
چشمِ شب حیراں ہے میرے پیرتوِ سیّار سے

غزل

مکاں میں قیدِ صدا کی دہشت
مکاں سے باہر خلا کی دہشت

ہُوا ہے خوفِ خدا سے خالی
ہے اِس نگر میں بلا کی دہشت

گھِرا ہُوا ہوں مَیں اس میں ہر طرف سے
ہے آئینے میں ہوا کی دہشت

زمیں پہ ہر سمت حدِّ آخر
فلک پہ لا انتہا کی دہشت

شجر کے سائے میں موت دیکھو
ثمر میں اُس کے فنا کی دہشت

بدن ہے ہشیار دل کے ڈر سے
نظر میں آوازِ پا کی دہشت

کھڑی ہے رستے کی منزلوں پہ
مناظرِ دیر پا کی دہشت

سراب سا اک گزر رہا ہے
وہی ہے پیشِ چشمِ وا کی دہشت

منیرؔ خوں میں اُتر رہی ہے
قرارِ بے مدّعا کی دہشت

غزل

اُگا سبزہ در و دیوار پر آہستہ آہستہ
ہُوا خالی صداؤں سے نگر آہستہ آہستہ

گِھرا بادل خموشی سے خزاں آثار باغوں پر
ہلے ٹھنڈی ہواؤں میں شجر آہستہ آہستہ

بہت ہی سُست تھا منظر لہو کے رنگ لانے کا
نشاں آخر ہُوا یہ سُرخ تر آہستہ آہستہ

چمک زر کی اُسے آخر مکانِ خاک میں لائی
بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ

مرے باہر فصیلیں تھیں غبارِ خاک و باراں کی
ملی مجھ کو ترے غم کی خبر آہستہ آہستہ

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

غزل

لازم نہیں کہ اُس کو بھی میرا خیال ہو
جو میرا حال ہے، وہی اُس کا بھی حال ہو

کچھ اور دل گداز ہوں اس شہرِ سنگ میں
کچھ اور پُر ملال، ہوائے ملال ہو

باتیں تو ہوں کہ کچھ تو دلوں کی خبر ملے
آپس میں اپنے کچھ تو جواب و سوال ہو

رہتے ہیں آج جس میں جسے دیکھتے ہیں ہم
ممکن ہے یہ گزشتہ کا خواب و خیال ہو

سب شور شہرِ خاک کا ہے قربِ آب سے
پانی نہ ہو تو شہر کا جینا محال ہو

معدوم ہوتی جاتی ہُوئی شے ہے یہ جہاں
ہر چیز اس کی جیسے فنا کی مثال ہو

کوئی خبر خوشی کی کہیں سے ملے منیر
ان روز و شب میں ایسا بھی اک دن کمال ہو

غزل

آسماں اک سایہ جیسے خالی ہاتھوں پر
اور زمیں اک مارِ خاک کا قیمتی دھاتوں پر

سود و زیاں کے اندیشے بھی اس کی بزم میں بھٹکے
ورنہ یقیں اور ہم کر لیتے اس کی باتوں پر

پُورا باغ دمک اُٹھا تھا گہری روشنی میں
رنگِ برق سفر میں تھا بھیگی برساتوں پر

سنّاٹا جنگل کی طرح ہے ان دیواروں کا
دشمن کا دھوکا ہوتا ہے شہر کی راتوں پر

جسم کا خون سمٹ آیا تھا ڈری نگاہوں میں
زر کی زردی ٹھنڈی ہوئی تھی پیلے ہاتھوں پر

مجھے منیرؔ افسوس ہوا ہے کر کے یاد اُسے
کبھی کبھی دُکھ بھی ہوتا ہے گزری باتوں پر

انتظار حسین

ہجرت کا ثمر

درصل میں اور منیر نیازی جنت سے ایک ہی وقت میں نکالے گئے تھے ہم نے ایک دوسرے کو اسی حیثیت میں پہچانا ہے۔ چلتے پھرتے کسی موڑ پر ہماری مڈھ بھیڑ ہوتی ہے۔ منیر نیازی سنانے لگتا ہے کہ اس کی بستی میں آموں کے کیسے گھنے پیڑ تھے۔ میں بیان کرنے لگتا ہوں کہ اپنی بستی میں شام کیسے پڑتی تھی اور مور کس رنگ سے بولتا تھا منیر نے ہمیشہ اسی طرح سنایا اور سنا جیسے وہ یہ داستان پہلی مرتبہ سنا رہا ہے اور پہلی مرتبہ سُن رہا ہے۔ ایک ملال کے ساتھ سناتا ہے اور ایک حیرت کے ساتھ سنتا ہے۔ ہم اپنی گمشدہ جنت اپنے دھیان میں بسائے پھرتے ہیں۔ اوروں کے تصور میں بھی لے بسا تو رہنا چاہیے تھا۔ مگر لگتا یوں ہے کہ سب نے کسی نہ کسی رنگ سے اس کی تلافی کرلی ہے یا ضعف حافظہ نے ان کی مدد کی ہے۔ مگر ہمارا حافظہ ہمارا دشمن بن گیا۔ حافظے نے بی بی حوا کو بھی بہت ستایا تھا۔ جنّت سے نکلنے کے بعد انھیں جنّت ایک عمر تک یاد آتی رہی۔ انھوں نے جنّت کو بہت یاد کیا اور بہت روئیں۔ جنّت کی یاد میں بہنے والے آنسو جو زمین پہ گرے ان سے مہندی کے پیڑ اُگے" قصص الانبیا" میں لکھا ہے کہ روئے ارض پر جتنے مہندی کے پیڑ ہیں وہ سب بی بی حوا کے آنسوؤں کا فیض ہیں۔

مجھے مہندی کے پیڑ اور منیر کے شعر اچھے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان میں تھوڑی میری آنکھوں کی نمی بھی شامل ہے۔ جب منیر اپنے خانپور کو پکارتا ہے تو میرا بھی ایک بستی کو پکارنے کو جی چاہتا ہے۔ جب وہ اپنے باغوں اور اپنے جنگل کا ذکر کرتا ہے تو میں اسے سی عالم میں چھوڑ کر اپنے جنگل کی طرف نکل جاتا ہوں۔ ہماری بستی کا جنگل کچھ بہت

گھنا نہیں تھا مگر میری یادوں نے اسے گھنا بنا دیا ہے۔ جب میں منیر نیازی کے شعر پڑھتا ہوں تو لگتا ہے کہ یہ جنگل اور زیادہ گھنا ہو گیا ہے اور زیادہ پھیل گیا ہے سو اپنا جنگل بہت گھنا ہو گیا ہے، اور زیادہ پھیل گیا ہے۔ سو اب اپنا جنگل بہت گھنا اور بہت پھیلا ہوا ہے۔ لیکن بات یہاں آ کر ختم نہیں ہو جاتی۔ لگتا یہ ہے کہ اس سے آگے بھی کوئی جنگل ہے۔ اپنے جنگل میں چلتے چلتے میں اچانک کسی اور ہی جنگل میں جا نکلتا ہوں، زیادہ بڑے اور زیادہ پُر ہول جنگل میں۔ مجھے ڈر لگنے لگتا ہے، جیسے میں عہدِ قدیم میں سانس لے رہا ہوں۔ شاید عہدِ قدیم بھی ہمارے بچپن کے منطقے کے آس پاس ہی واقع ہے۔ یا پھر منیر نیازی نے اپنے شعروں سے کوئی عجیب سی پگڈنڈی بنا دی ہے کہ وہ خانپور سے چل کر میری بستی کو چھوتی ہوئی عہدِ قدیم میں جا نکلتی ہے۔ تو اب صورت یہ ہے کہ میں منیر کے شعر پڑھتے ہوئے اپنے بچپن کے راستے عہدِ قدیم میں جا نکلتا ہوں۔ بچپن کے اندیشے اور وسوسے عہدِ قدیم کے آدمی کے وسوسوں اور اندیشوں سے جا ملتے ہیں۔

جنگلوں میں کوئی پیچھے سے بلائے تو منیرؔ
مڑ کے رستے میں کبھی اُس کی طرف مت دیکھو

مگر مجھے لگتا ہے کہ خود منیر نے مُڑ کر دیکھ لیا ہے

وسوسے اور اندیشے عہدِ قدیم سے آج تک آتے آتے آدمی کے اندر اتر گئے ہیں۔ اب باہر سے ہم ہمت والے ہیں، اندر سے خوف زدہ ہیں۔ پہلے ہم مُڑ کر نہیں دیکھتے تھے، اب اندر دیکھنے سے ڈرتے ہیں۔ کیا اندر بھی کوئی جنگل ہے؟ جنگل اصل میں پہلے ہمارے باہر تھا، اب ہمارے اندر ہے۔ ہم تو جنگل سے نکل آئے اور بڑے بڑے شہر تعمیر کر کے اپنے چاروں طرف فصیلیں کھڑی کر لیں، مگر جنگل ہماری بے خبری میں ہمارے اندر اتر گیا اور سات پردوں میں چھپ کر بیٹھ رہا۔ اب دُ

ہمارے سو رہا ہے۔ منیر نیازی وہ شخص ہے جس کے اندر جنگل جاگ اٹھا ہے اور سنسنا رہا ہے۔ اس نے مڑ کے جو دیکھ لیا ہے۔ اس کی شاعری کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہم جنگل میں چل رہے ہیں اور پاتال میں اتر رہے ہیں۔ عجب عجب تصویریں اُبھرتی ہیں۔

دبی ہوئی ہے زیرِ زمیں اک دہشت گُنگ صداؤں کی
بجلی سی کہیں لرز رہی ہے کسی چھُپے تہ خانے میں

کرے گا تو بیمار مجھے یا
بنے گا نامعلوم کا ڈر
رہے گا دائم گہری تہ میں
جیسے اندھیرے میں کوئی در

پھر میرے تصور میں عجب عجب تصویریں اُبھرنے لگتی ہیں۔ میں اپنے پاتال میں اُترنے لگتا ہوں۔ اگلی پچھلی کہانیاں اور بھُولے بسرے قصے یاد آنے لگتے ہیں۔ چمکتی دمکتی اشرفیوں سے بھری زمین دوز دیگیں۔ راجہ باسٹھ۔ راجہ باسٹھ کے محل کے سنہری بُرج جو زمین کے اندھیرے میں جگمگ جگمگ کرتے ہیں۔ میری نانی اماں بہت سنایا کرتی تھیں کہ زمین میں یہ دبی دیگیں کس طرح اندر ہی اندر سفر کرتی ہیں اور پکارتی ہیں اور جب کسی کو یہ پکار سنائی دے جاتی ہے تو اس پر کیا بیتتی ہے۔ ان کی باتیں اسی پکار کو سننے کی خواہش کی غمازی کرتی تھیں۔ مگر وہ ڈرتی بھی رہتی تھیں، کہیں سچ مچ کسی سنسان اندھیری رات میں یہ پکار انہیں سنائی نہ دے جائے۔ سانپ ان دیگوں کی رکھوالی کرتا ہے۔ میری نانی اماں بتاتی تھیں کہ سانپوں کا ایک راجہ ہے۔ اسے وہ راجہ باسٹھ کہتی تھیں۔ ہندو دیو مالا کے تذکروں میں اس کا نام راجہ بسوکا لکھا ہے۔ اس کا محل سونے کا بنا ہوا ہے اور پاتال کے اندھیرے میں جگمگاتا ہے۔ میری نانی اماں

سانپ کا نام شاذ و نادر ہی لیتی تھیں۔ اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر کرتی تھیں۔ منیر نیازی بھی اس کا نام لینے سے ڈرتا ہے، مگر اس کا ذکر بہت کرتا ہے۔ اتنا خوف اور اتنی کشش! آخر کیوں؟

نامعلوم کا خوف اور نامعلوم کے لیے کشش! اس خوف اور کشش کی صورت منیر نیازی کی شاعری میں کچھ ایسی ہے جیسے آدم و حوا ابھی ابھی جنت سے نکل کر زمین پر آئے ہیں۔ زمین ڈرا بھی رہی ہے اور اپنی طرف کھینچ بھی رہی ہے۔ پاتال بھی ایک بھید ہے اور وسعت بھی ایک بھید ہے۔ بھید بھری فضا کبھی اس حوالے سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی اُس حوالے سے، اور شعر کے ساتھ دیومالائی قصے اور پرانی کہانیاں لپٹی چلی آتی ہیں۔

سفر میں ہے جو ازل سے یہ وہ بلا ہی نہ ہو — کواڑ کھول کے دیکھو کہیں ہوا ہی نہ ہو
نہ جا کہ اس سے پرے دشتِ مرگ ہو شاید — پلٹنا چاہیں وہاں سے تو راستا ہی نہ ہو

منیر نیازی کے لیے زمین اپنے پاتال اور اپنے پھیلاؤ کے ساتھ دہشت و حیرت سے بھرا ایک تجربہ ہے۔ مگر پھر وہی سوال کہ آخر کیوں؟ کیا اس کا تعلق بھی جنت سے نکلنے کے قصے سے ہے؟ کیا یہ ہجرت کا ثمر ہے؟ مہندی کے یہ پیڑ خود بخود تو نہیں اُگ آئے۔ قدیم آدمی کے تجربے تو ہمارے آپ کے اندر اور دیومالاؤں اور داستانوں کے اندر دبے پڑے ہیں۔ آخر کوئی واقعہ تو ہوا ہے کہ یہ تجربے پھر سے زندہ ہوئے اور ایک نئی معنویت اختیار کر گئے۔

ہجرت کا تجربہ لکھنے والوں کی ایک پوری نسل کو اردو ادب کی باقی نسلوں سے الگ کرتا ہے۔ اس نسل کے مختلف لکھنے والوں کے یہاں اس تجربے نے الگ الگ روپ دکھائے ہیں۔ منیر نیازی کے یہاں اس کے فیض سے ایسا روپ ابھرا ہے جو ایک نئی دیومالا کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ باقی نئی شاعری کا کیا ہے، وہ تو کسی تجربے کے حوالے کے بغیر خالی ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہے۔

چھ رنگیں دروازے

(شاعری)

منیر نیازی

چھ رنگیں دروازے

خُوبصُورت پاکستان کے نام

ترتیب

منیر کی منوّر شاعری

آخری سچائی ــ آخری حقیقت تک رسائی تو شاید ناممکن ہے مگر بڑی شاعری ، حقیقت تک رسائی کا ذریعہ نہ سہی ، اس رسائی کے لیے جدوجہد کی علامت ضرور ہے۔ بڑی شاعری ، آخری حقیقت تک جانے والی سمت کی نشان دہی ضرور کر دیتی ہے اور منیر نیازی کی شاعری اس کا ایک ثبوت ہے ۔

منیر نیازی کے دل و دماغ میں بیشتر ماضی کی یادیں تحریک پیدا کرتی ہیں مگر یہ یادیں اتنی تابندہ اور پاکیزہ ہیں کہ ان کی بازیافت میں نہ حال کو کسی گزند کا احتمال ہے اور نہ مستقبل کو کسی نقصان کا خطرہ ہے ۔ جو چیز خیالات و احساسات کو روشن کرتی ہو اور انسان کے دوامی جذبوں پر آفتاب طلوع کرتی ہو ، اس کی ضرورت حال اور مستقبل دونوں کو ہے ۔ منیر نیازی انھیں مثبت اور منور بازیافتوں کا شاعر ہے۔ مورخ اور شاعر کے طریقِ بازیافت میں یہی تو فرق ہے کہ مورخ کی بازیافت محض بازیافت ہے ۔ شاعر کی بازیافت فن میں ڈھل کر پیش رفت کا کردار ادا کرتی ہے ۔ جذبے ، خیال اور فکر کے لیے آخری حقیقت کی سمت نمائی صرف اس طرح ممکن ہے ۔

اگر منیر نیازی اپنے عصر کے شعراء سے کچھ الگ ہٹ کر آگے بڑھ رہا ہے تو اس کی ایک وجہ اس کی تیز دھار انفرادیت ہے جو پھیل کر انانیت تک بھی پہنچ جاتی ہے ۔ مگر منیر کی انا ایک بیراگی انا نہیں ہے ۔ وہ خاص واردات ، خاص تجربات کی انا ہے ۔ چنانچہ اس انا کے اجمال میں لاکھوں باشعور و حساس اور صورتِ حال سے غیر مطمئن افراد کی تفصیل پوشیدہ ہوتی ہے ۔ منیر نیازی کی شاعری بظاہر بہت سلیس ،

بہت سیدھی سادی ہے مگر بین السطور اتنی گمبھیر ہے جیسے "انا الحق" کا نعرہ بظاہر بہت سادہ تھا مگر اس کے عقب میں انسان کی روحانی اور وجدانی واردات کی کائناتیں آباد تھیں۔

قدرت کے خارجی مظاہر پر اردو میں بھی بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں اور اشعار کہے گئے ہیں مگر جس شاعر کے ہاں خارجی کائنات انسان کی باطنی کائنات کا ایک ناگزیر حصہ بن کر رہ گئی ہے وہ اس دور میں منیر نیازی ہی ہے۔ اس کی نظمیں (اور غزلیں بھی) دیکھیے تو فوری تاثر یہ ہوگا کہ شاعر اپنے مشاہدے کے کمالات دکھا رہا ہے مگر پھر یکایک آپ کو معلوم ہوگا کہ ان درختوں اور شاخوں، ان پتوں اور پھولوں، ان سورجوں اور دھوپوں، ان پہاڑوں اور دریاؤں، ان گھروں اور گلیوں، ان رنگوں اور بے رنگیوں میں سے ایک ایک میں ایک نہ ایک نہایت نازک مگر بنیادی انسانی جذبہ یوں گھلا ہوا ہے جیسے رنگ میں خوشبو گھلی ہوتی ہے۔ منیر کی شاعری محض مشاہدے کی شاعری نہیں ہے۔ یہ مشاہدات تو اس کے محسوسات کا صرف پس منظر فراہم کرتے ہیں۔ احساس کا یہ منقش اظہار منیر نیازی کا منفرد اسلوب ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کی شاعری کو اگر کامیاب اور کارگر شاعری قرار دیا جائے تو یہ مبالغہ نہیں ہے، صداقت بیانی ہے۔ منیر نیازی کی یہ شاعری آخری سچائی کی سمت جانے والوں کے سفر کو آسان اور آسودہ بنا دیتی ہے۔

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ منیر نیازی تنہائی کا شاعر ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہر اچھا فن کار تنہا ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی صورتِ حالات پر قناعت نہیں کر سکتا اسلیے تنہا ہے۔ وہ اس بدصورت دنیا میں خوب صورتیوں کا متلاشی ہے اس لیے تنہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تنہائی کروڑوں ہمنفسوں اور ہم نصیبوں سے آباد ہوتی ہے۔ اگر منیر نیازی کی تنہائی پسندی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے خول میں

اسیر ہے تو میں کیا تردید کروں گا، منیر کا یہ مجموعۂ کلام ہی اس مغالطے کی مسکت تردید ہے۔

میں آخر میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ منیر پر بعض اوقات صوفیانہ واردات بھی گزرتی ہے البتہ اس واردات کے اظہار کے لیے وہ قدیم فارسی اور اردو شاعری کی خاص اصطلاحات و تراکیب سے کام نہیں لیتا۔ اس کی لفظیات اس کی اپنی ہیں۔ اس پر مستزاد اس کا مکالماتی طرزِ ادا ہے جیسے وہ ایک بھری محفل کو بتا رہا ہے کہ — پھر یوں ہوا کہ —!! بظاہر یہ منیر کی سادگی اور سادہ روی ہے، مگر میں قارئینِ کرام کو خبردار کر دوں کہ منیر بڑا ہی پُرکار شاعر ہے۔ خواجہ میر درد اور اصغر گونڈوی کے تصوّف سے منیر کا اندازِ تصوّف قطعی الگ ہے۔ وہ ہمہ اوست اور ہمہ از اوست میں نہیں الجھتا۔ اس کا سرمایہ ایک کرید ہے، ایک جستجو، کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں کس کا ہاتھ ہے اور یہ ہاتھ صرف قوت و ہیبت ہے یا صرف نور و جمال ہے۔ منیر الٰہیات میں بھی جمالیات کی سی واردات کے تجربے میں سے گزر رہا ہے اور اردو شاعری میں یہ قطعی نیا اور امکانات سے پُر تجربہ ہے۔

۱۰۔ جنوری ۱۹۷۹ء
لاہور

احمد ندیم قاسمی

چپ گلی محلّے ہیں
شام کی طرح آیا

بے شمار باغوں پر
ابر کی طرح چھایا

خواب میں کبھی دیکھا
سامنے کبھی آیا

طائروں کی دل سوزی
رہروں کی جانکاہی

رات کی مناجاتیں
بخششِ سحرگاہی

رعد جب گرجتا ہے
کوہ جب لرزتے ہیں

بے کنار دشتوں پر
ابر جب برستے ہیں

اک طویل مستی کے
بے شمار حصّے ہیں

ساری یاد اُس کی ہے
سارے اس کے قصّے ہیں

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

رسولِ کریمؐ کی یاد

میں جو اک برباد ہوں آباد رکھتا ہے مجھے
دیر تک اسمِ محمدؐ شاد رکھتا ہے مجھے

سفر میں ایک منزل یہ بھی

اک روئے دل فریب و دلآرا ہے زندگی
اک اور زندگی کا اشارہ ہے زندگی
یا میری چشمِ مست کا دھوکا ہے زندگی
اے ربِ ذوالجلال بتا کیا ہے زندگی

قصرِ شہی کی قید میں جینا ہے زندگی
محرومیوں کی آگ میں جلنا ہے زندگی

بے سود انتظار میں مرنا ہے زندگی
اک شہرِ اجنبی کا تماشا ہے زندگی
ملتی ہے اس سفر میں کہیں منزلِ مراد
یا پھر اسی طرح سے بھٹکنا ہے زندگی

یہ رازِ خاص مجھ پہ کبھی آشکار کر
مجھ کو بھی اپنے دل کا کبھی رازدار کر

چھ رنگیں دروازے

چھ رنگوں کے پھول کھلے ہیں
میرے گھر کے آگے
کسی نئے سکھ کے دروازے
خواب سے جیسے جاگے
ان کے پیچھے رنگ بہت ہیں
اور بہت اندازے
ان کے پیچھے شہر بہت ہیں
اور بہت دروازے

لاہور میں ایک صبح

شبنم چمک رہی ہے سورج کی روشنی میں
رنگت مہک رہی ہے پھولوں کی تازگی میں
تتلی نے پنکھ کھولے اک لال پنکھڑی پر
جیسے کتاب کوئی مخمل کی پالکی پر
اتری کسی جہاں سے منظر کی ایک رخی پر

کراچی کی سیر کے دوران

نصف شب سے صبح دم کے راستے میں بحر ہے
صبح سے پھر نصف شب کے راستے میں بحر ہے
شام کے آغاز سے جو تشنگی سی دل میں تھی
ایک کم آباد قریے کی ہوائیں سیر کی
یہ مری خواہش سوادِ بحر میں پوری ہوئی

ایک منظر

سات کلیاں سنگترے کے پیڑ سے جھڑ کر گریں
صاف، چٹیل گوشۂ گلشن کی ویراں راہ پر

پیلا پھول اِک زرد گڑھا ہے
جس میں شہد کی مکھّی ہے
ڈھونڈ رہی ہے چیز کوئی
جو اس نے یہاں تھی رکھّی
شہد کی بوند کہ زہر ہے کوئی
یا کوئی پھول کی پتّی
پیلا پھول ہے روشن جیسے
دھوپ میں روشن بتّی

صبحِ صادق کا پھیلاؤ

اذاں مسجدوں سے اٹھی جِس گھڑی
ہواؤں کے دَل اور گہرے ہوئے
کنارے فلک کے گلابی ہوئے
گلابی سے پھر وہ سنہرے ہوئے

ان لوگوں سے خوابوں میں ملنا ہی اچھا رہتا ہے

تھوڑی دیر کو ساتھ رہے کسی دھندلے شہر کے نقشے پر
ہاتھ میں ہاتھ دیے گھومے کہیں دور دراز کے رستے پر
بے پروہ اسمانوں پہ دو اڑتے ہوئے گیتوں کی طرح
غصّے میں کبھی لڑتے ہوئے کبھی پیٹے ہوئے پیڑوں کی طرح
اپنی اپنی راہ چلے پھر آخرِ شب کے میداں میں
اپنے اپنے گھر کو جاتے دو حیران بچّوں کی طرح

کہنے والی بات میں دیر کی وجہ

یہی اصلِ حقیقت ہے
کہ میری بے رخی چاہت
ہوئی مثلِ قفس مجھ کو

"مجھے تم سے محبت ہے"
بس اتنی بات کہنے میں
لگے بارہ برس مجھ کو

گانے والے پنچھی کی ہجرت

ہری شاخ کانپ رہی ہے
تھوڑی دیر پہلے
یہاں ایک عجیب رنگ کا پنچھی بیٹھا گا رہا تھا
کسی نے اسے ڈرا دیا اور وہ اڑ گیا
ہری شاخ اس کے اڑنے کے بوجھ سے کانپی تھی
کچھ دیر اسی طرح کانپتی رہے گی

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

شہروں کے مکان

ان مکانوں میں ہے کیا
بے روح لوگوں کے سوا

ثابت و سیّارساعتیں

صبحِ بہار میں اسے
جا کے مِلوں گا میں کبھی
جس سے بچھڑ گیا تھا میں
عہدِ خزاں کی شام میں

شامِ فراق تھی مجھے
بابِ دیارِ یار سی
سیرِ سوادِ دل رُبا
نافۂ مشکبار سی
خواہشِ ارضِ منتظر
تازہ نئے نظام میں

فصلِ بہاراں میں شہر کے فکر

نیم، املی کے، سفیدے کے درختوں سے پرے
سبز حرفوں کی طرح کی تتلیاں، اُڑتی ہوئیں پھولوں، گھروں کے درمیاں
چند خوش، رنگیں مسافر قافلوں اور راستوں اور منزلوں کے درمیاں

اس کتابِ رنگ و نکہت کے علاقوں سے پرے
شہر کی خبروں سے کچھ افسردہ سا ہے دل مرا
فکرِ ہست و بود کی دیوانگی میں مبتلا ہے دل مرا
در سے باہر آکے دیکھو، دور تک میدان میں
گرد اڑاتی پھر رہی ہے پھر ستمبر کی ہوا
اس کے آخر پہ نگر ہے عصر کے ہیجان میں
اور سارے منظروں پر اک بے پایاں خلا

شکرپڑیاں کی پہاڑی پر نظم

کچھ دیارِ غیر کے کچھ اپنے قصبوں کے شجر
کچھ شناسا اور کچھ انجانے شہروں کے شجر
دوریوں پر سلسلے کہسارِ پر اسرار کے
اور اس دھندلے جہاں میں نیلے خوابوں کے شجر
اس مقامِ سبز سے نیچے نشیبِ شہر میں
ایک پاکیزہ سفیدی اور گلیوں کے شجر
میں ہوں اور سحرِ سفر ہے اور رستوں کی ہوا
سرفراز اقبال ہے اور اس کی باتوں کے شجر

خوبصورت زندگی کو ہم نے کیسے گزارا

آج کا دن کیسے گزرے گا کل گزرے گا کیسے

کل جو پریشانی میں بیتا وہ بھولے گا کیسے

کتنے دن ہم اور جئیں گے کام ہیں کتنے باقی

کتنے دکھ ہم کاٹ چکے ہیں اور ہیں کتنے باقی

خاص طرح کی سوچ تھی جس میں سیدھی بات گنوا دی

چھوٹے چھوٹے وہموں ہی میں ساری عمر بتا دی

کتنے بے کل نین ہیں اس کے
اک پل بھی انھیں چین نہیں

رت بسنت کی تتلیاں جیسے
خوابِ ابد کی کھڑکیاں جیسے
سورج پر دو بدلیاں جیسے

امر سہاگ کے ان نگروں میں
کوئی برہ کی رین نہیں

کچھ باتیں ان کہی رہنے دو

کچھ باتیں ان کہی رہنے دو
کچھ باتیں ان سنی رہنے دو
سب باتیں دل کی کہہ دیں اگر پھر باقی کیا رہ جائے گا
سب باتیں اس کی سن لیں اگر پھر باقی کیا رہ جائے گا
اک اوجھل بے کلی رہنے دو
اک رنگیں ان بنی دنیا پر
اک کھڑکی اَن کھلی رہنے دو

گھر بنانا چاہتا ہوں

گھر بنانا چاہتا ہوں میرا گھر کوئی نہیں
دامنِ کہسار میں یا ساحلِ دریا کے پاس
اونچی اونچی چوٹیوں پر سرحدِ صحرا کے پاس
متفق آبادیوں میں، وسعتِ تنہا کے پاس
روزِ روشن کے کنارے یا شبِ یلدا کے پاس
اس پریشانی میں میرا راہبر کوئی نہیں
خواہشیں ہی خواہشیں ہیں اور ہنر کوئی نہیں
گھر بنانا چاہتا ہوں میرا گھر کوئی نہیں

کوکتی ہے بنسری

کُوکتی ہے بنسری بیراگ کی
وصل کی گھڑیوں ملن کے دن کی سیما سے پرے

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

سو جاؤ، آرام کرو

سو جاؤ، آرام کرو
تم جو اتنے دکھی رہے ہو
سو جاؤ، آرام کرو
اب خوشیوں کو اپنے دل میں مہماں بن کر آنے دو
دل کو جلانے والے ظالم اندیشوں کو جانے دو
وہ جو تمھارے من میں بسی تھی
اس ناری نے اب تو تم سے ملنے کا اقرار کیا ہے

(جیمز میب کی نظم کا ترجمہ)

بیمار گلاب

لال گلاب کے پھول
تجھے تو روگ لگا ہے
وہ کیڑا جو شور مچاتے طوفانوں میں
رات کو اُڑتا پھرتا ہے
اور آنکھ سے اوجھل رہتا ہے
اس نے تیری خوشیوں کا
رنگیلا بستر دیکھ لیا ہے
اس کی بھید بھری چاہت نے
تن من تیرا پھونک دیا ہے

(ولیم بلیک)

منتشر ہے بہت

منتشر ہے بہت
حدِّ افلاک تک
حدِّ افلاک سے
عرصۂ خاک تک
نقش اس رنگ کا
دل سے کیسے اڑے
وسعتِ ہجر میں
تنگیِ وصل میں
اِتنا بکھرا ہُوا
اِتنا ٹوٹا ہُوا
خواب کیسے جڑے

امید کا گیت

تیری دور رس نگاہیں کوئی خواب دیکھتی ہیں
کھلے پانیوں کا جلوہ کہ سراب دیکھتی ہیں

کوئی پُرسکون مسکن کوئی غمگسار محفل
کوئی دل فریب منزل کوئی بامراد ساحل
جو اُتر رہی ہے دل پر وہ کتاب دیکھتی ہیں

کسی اجنبی جہاں کی ہے تلاش ان کو شاید
کسی ہم نفس کے آنے کی ہے آس ان کو شاید
کوئی خواب زندگی کا پسِ خواب دیکھتی ہیں

غزل

رات اتنی جا چکی ہے اور سونا ہے ابھی
اس نگر میں اک خوشی کا خواب بونا ہے ابھی

کیوں دیا دل اس محبت کم سن کو ایسے وقت میں
دل سی شے جس کے لیے بس اک کھلونا ہے ابھی

ایسی یادوں میں گھرے ہیں جن سے کچھ حاصل نہیں
اور کتنا وقت ان یادوں میں کھونا ہے ابھی

جو ہوا ہونا ہی تھا سو ہو گیا ہے دوستو
داغ اس عہدِ ستم کا دل سے دھونا ہے ابھی

ہم نے کھلتے دیکھنا ہے پھر خیابانِ بہار
شہر کے اطراف کی مٹی میں سونا ہے ابھی

بیٹھ جائیں سایۂ دامانِ احمدؐ میں منیر
اور پھر سوچیں وہ باتیں جن کو ہونا ہے ابھی

غزل

ایک نگر کے نقش بھلا دوں ایک نگر ایجاد کروں
ایک طرف خاموشی کر دوں ایک طرف آباد کروں

منزلِ شب جب طے کرنی ہے اپنے اکیلے دم سے ہی
کس کے لیے اس جگہ پہ رُک کر دن اپنا برباد کروں

بہت قدیم کا نام ہے کوئی ابر و ہوا کے طوفاں ہیں
نام جو میں اب بھول چکا ہوں کیسے اس کو یاد کروں

جا کے سنوں آثارِ چمن میں سائیں سائیں شاخوں کی
خالی محل کے برجوں سے دیدارِ برق و باد کروں

شعر منیرؔ لکھوں میں اٹھ کر صحنِ سحر کے رنگوں میں
یا پھر کام یہ نظمِ جہاں کا شام ڈھلے کے بعد کروں

غزل

خاکِ میداں کی حدّتوں میں سفر
جیسے حیرت کی وسعتوں میں سفر

خوب لگتا ہے اس کے ساتھ مجھے
وصل کی شب کی خواہشوں میں سفر

اس نگر میں قیام ایسا ہے
جیسے بے انت پانیوں میں سفر

دیر تک سیرِ شہرِ خوباں کی
دور تک دل کے موسموں میں سفر

بیٹھے بیٹھے منیرؔ تھک سے گئے
کر کے دیکھیں گے اِن دنوں میں سفر

غزل

نام بے حد تھے مگر ان کا نشاں کوئی نہ تھا
بستیاں ہی بستیاں تھیں پاسباں کوئی نہ تھا

خرم و شاداب چہرے ثابت و سیّار دل
اک زمیں ایسی تھی جس کا آسماں کوئی نہ تھا

کیا بلا کی شام تھی صبحوں، شبوں کے درمیاں
اور ہیں ان منزلوں پر تھا جہاں کوئی نہ تھا

ہر مکاں اک راز تھا اپنے مکینوں کے سبب
رشتہ میرے اور جن کے درمیاں کوئی نہ تھا

تھا وہاں موجود کوئی بام و در کے اس طرف
خامشی تھی اس قدر جیسے وہاں کوئی نہ تھا

گونجتی تھی بنسری چاروں دشاؤں میں منیر
پر نگر میں اس صدا کا رازداں کوئی نہ تھا

غزل

بے چین بہت پھرنا گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی دہکائے ہوئے رہنا

چھلکائے ہوئے چلنا خوشبو لبِ لعلیں کی
اک باغ سا ساتھ اپنے مہکائے ہوئے رہنا

اس حسن کا شیوہ ہے جب عشق نظر آئے
پردے میں چلے جانا شرمائے ہوئے رہنا

اک شام سی کر رکھنا کاجل کے کرشمے سے
اک چاند سا آنکھوں میں چمکائے ہوئے رہنا

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

غزل

دن اگر چڑھتا اُدھر سے میں ادھر سے جاگتا
حسن بسارا مشرقوں کا ساتھ میرے جاگتا

میں اگر ہلتا نہ اس سے اس ازل کی شام میں
خواب اِن دیوار و در کا دل میں کیسے جاگتا

ہے مثالِ بادِ گلشن جاگنا اُس شوخ کا
رنگ جیسے دور کا رنگوں کے پیچھے جاگتا

اب وہ گھر باقی نہیں پر کاش اس تعمیر سے
ایک شہرِ آرزو آنکھوں کے آگے جاگتا

چاند چڑھتا دیکھنا بے حد سمندر پر منیر
دیکھنا پھر بحر کو اس کی کشش سے جاگتا

غزل

سایۂ قصرِ یار میں بیٹھا
میں تھا اپنے خمار میں بیٹھا

اس کا آنا تھا خواب میں آنا
میں عبث انتظار میں بیٹھا

کوئی صورت نہیں ہے اس جیسی
اس کو دیکھو ہزار میں بیٹھا

اس کو خوشیوں سے خوف آتا ہے
وہم کیا ذہنِ یار میں بیٹھا

ہم بھی رستوں میں پھر رہے تھے نیرؔ
وہ بھی تھا رہگذار میں بیٹھا

غزل

نسل در نسل کے افکارِ غزل سے نکلا
آتنی دیواروں سے میں اپنے عمل سے نکلا

سایۂ اشجارِ کہن سال کا جنت تھا مگر
میں بھی کچھ سوچ کے اس خوابِ ازل سے نکلا

دور تک پانی کے تالاب تھے ہنگامِ سحر
شمس اس آب کے اک تازہ کنول سے نکلا

وسعتِ شام میں، سُرخی میں، سیاہی میں ہوا
رنگ اک سب سے جدا دشت و جبل سے نکلا

انت تھا جیسے ہر اک عشرتِ ممکن کا منیر
ہجر کا وقت اسی وصل کے پل سے نکلا

کچھ وقت بعد اس سے جو نفرت ہوئی مجھے
اس سے نئی طرح کی مسرت ہوئی مجھے

ہے شرح و بستِ خوابِ جنوں اک محال کام
مت پوچھیے جو اس میں اذیّت ہوئی مجھے

نسلوں کا فاصلہ ہے مرے ان کے درمیاں
اس وقت جن بتوں سے محبت ہوئی مجھے

سو پشت سے تھا پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت ہوئی مجھے

کوئی تو ہے منیر جسے فکر ہے مری
یہ جان کر عجیب سی حیرت ہوئی مجھے

غزل

بے خیالی میں یونہی بس اک ارادہ کر لیا
اپنے دل کے شوق کو حد سے زیادہ کر لیا

جانتے تھے دونوں ہم اس کو نبھا سکتے نہیں
اس نے وعدہ کر لیا میں نے بھی وعدہ کر لیا

غیر سے نفرت جو پا لی خرچ خود پر ہو گئی
جتنے ہم تھے ہم نے خود کو اس سے آدھا کر لیا

شام کے رنگوں میں رکھ کر صاف پانی کا گلاس
آبِ سادہ کو حریفِ رنگِ بادہ کر لیا

ہجرتوں کا خوف تھا یا پُرکشش کہنہ مقام
کیا تھا جس کو ہم نے خود دیوارِ جادہ کر لیا

ایک ایسا شخص بنتا جا رہا ہوں میں منیر
جس نے خود پر بند حسن و جام و بادہ کر لیا

غزل

اور بھی قصّے ہیں جو میں داستاں کرتا نہیں
اور بھی کچھ غم ہیں جن کو میں بیاں کرتا نہیں

راز ہیں جن کا امیں ہوں میں ہی بس اس دہر میں
اس خبر کا میں کسی کو راز داں کرتا نہیں

جو ہنر جس میں نہیں ہے مدعی اس کا ہے وہ
کوئی اپنی اصل کو اپنا نشاں کرتا نہیں

صبر اک طاقت ہے میری سختیِ ایّام میں
اس صفت سے آدمی غم میں فغاں کرتا نہیں

عشق کرتا ہوں بتانِ شہر سے میں بھی منیرؔ
میں مگر اس شوق میں جی کا زیاں کرتا نہیں

غزل

وحدت سے کثرت کی طرف
کثرت سے وحدت کی طرف

دائم اک بے چینی سی ہے
آخر کی حسرت کی طرف

ایک مقام قیام کا ہے
بیچ میں کی وسعت کی طرف

رخ شہروں کی شام کا ہے
صحرا کی وحشت کی طرف

اک محصور صدا سی ہے
بے حد چپ پربت کی طرف

شاید چاند نکل آیا ہے
دیکھ منیرؔ اس چھت کی طرف

غزل

اِک عالمِ ہجراں ہی اب ہم کو پسند آیا
یہ خانۂ ویراں ہی اب ہم کو پسند آیا

بے نام و نشاں رہنا غربت کے علاقے میں
یہ شہر بھی دلکش تھا تب ہم کو پسند آیا

تھا لال ہوا منظر سورج کے نکلنے سے
وہ وقت تھا وہ چہرہ جب ہم کو پسند آیا

ہے قطع تعلق سے دل خوش بھی بہت اپنا
اِک حد ہی بنا لینا کب ہم کو پسند آیا

آنا وہ منیرؔ اس کا بے خوف و خطر ہم تک
یہ طرفہ تماشا بھی شب دل کو پسند آیا

ساری زمین سارا جہاں راز ہی تو ہے
یہ بود و ہستِ کون و مکاں راز ہی تو ہے

ہے آب اپنی وسعتِ لا حد سے ایک راز
خوابِ گرانِ کوہِ گراں راز ہی تو ہے

کرتا ہوں میں بیاں جو کبھی اپنے شعر میں
شہرِ خیالِ حسنِ بتاں راز ہی تو ہے

آنا رُتوں کا جا کے کوئی راز ہے عجیب
نخلِ بہار و برگِ خزاں راز ہی تو ہے

ہے کس کے انتظار میں بے چین سب جہاں
بھیجا گیا ہے کون یہاں راز ہی تو ہے

میرا کلام اس کے لیے راز ہے منیر
میرے لیے نگر کی زباں راز ہی تو ہے

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا

ہستی ہی اپنی کیا ہے زمانے کے سامنے
اِک خواب ہیں جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا

اب کون منتظر ہے ہمارے لیے وہاں
شام آگئی ہے لَوٹ کے گھر جائیں ہم تو کیا

دل کی خلش تو ساتھ رہے گی تمام عمر
دریائے غم کے پار اُتر جائیں ہم تو کیا

ردا اس چمن کی اڑا لے گئی
درختوں کے پتّے ہوا لے گئی

جو حرف اپنے دِل کے ٹھکانوں میں تھے
بہت دُور ان کو صدا لے گئی

چلا میں صعوبت سے پُر راہ پر
جہاں تک مجھے انتہا لے گئی

گئی جس گھڑی شامِ سحرِ وفا
مناظر سے اک رنگ سا لے گئی

نشاں اک پرانا کنارے پہ تھا
اسے موجِ دریا بہا لے گئی

منیرؔ اتنا حسن اس زمانے میں تھا
کہاں اس کو کوئی بلا لے گئی

غزل

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد
پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اس نے کیا

راہبر میرا بنا گمراہ کرنے کے لیے
مجھ کو سیدھے راستے سے در بدر اس نے کیا

شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا
پھر مجھے اس شہر میں نا معتبر اس نے کیا

شہر کو برباد کر کے رکھ دیا اس نے منیرؔ
شہر پر یہ ظلم میرے نام پر اس نے کیا

ہر مشکل موسم کی حد پر

شروع بہار کے ہیں آثار
سبز ہوئے انجیر کے پتّے
سبز ہوئی پیپل کی قطار
ہری ہری چلمن کے پیچھے
اُڑتا ہے سُرخی کا غبار
ایک قدیم زمانہ سا ہے
اینٹوں کی اُونچی دیوار
اوٹ میں اک سنسان جگہ کی
لیے ہوئے کلیوں کے ہار
کھڑی ہے اک آسان بہار

ایک اُمّت کے گزرنے کے بعد کا وقت

وہ عہد جو دھند لا گیا
اک چاند جو گہنا گیا
وہ ساتھ اپنے لے گیا
اپنی ردائے دِل کُشا
رستے دکھاتی روشنی
گہری کشش موجود کی
ہونے کی مستی سے بھرے
رشتے گمان و لمس کے

اب اصل تو باقی نہیں
اس کا یقیں باقی نہیں
اِک نقل جیسے اس کی ہے
بے روح جیسی کوئی شے

یہ درمیاں کے سلسلے

الجھے ہوئے حیرت کدے

ٹوٹی ہوئی رنگینیاں

بگڑی ہوئی رعنائیاں

آنے سے پہلے خواب کے

کھلنے سے پہلے باب کے

بڑھتی ہوئی بے چینیاں

بڑھتی ہوئی تنہائیاں

نئی محفل میں پہلی شناسائی

نئی جگہ تھی دور دور تک آخر پہ دیواریں شب کی
کچھ یاروں نے برپا کر دی اک محفل کچھ اپنے ڈھب کی
اونچے در سے داخل ہو کر صاف نشیب میں بیٹھے جا کر
ایک مقام میں ہوئے اکٹھے رونق اور ویرانی آ کر
مرکزِ در سے جشنِ بپا تک سیر تھی شامِ مہر و وفا کی
خوشی تھی اس سے ملنے جیسی بے چینی تھی ابر و ہوا کی
سب رنگوں کے لوگ جمع تھے ایک ہی منزل تھی ان سب کی
اک بستی آلام سے خالی ایک فضا کسی خوابِ طرب کی
جنگل کی شادابی جیسا پہنا تھا کوئی جلوہ اس نے
پیراہن اک نئی وضع کا کھلے سمندر جیسا اس نے
کر رکھا تھا چہرہ اپنا دکھ سکھ سے بے پروا اس نے
میری طرف تکنے سے پہلے چاروں جانب دیکھا اس نے

غزل

کسی کو اپنے عمل کا حساب کیا دیتے
سوال سارے غلط تھے جواب کیا دیتے

خراب صدیوں کی بے خوابیاں تھیں آنکھوں میں
اب اِن بے انت خلاؤں میں خواب کیا دیتے

ہوا کی طرح مسافر تھے دلبروں کے دل
انھیں بس ایک ہی گھر کا عذاب کیا دیتے

شراب دل کی طلب تھی شرع کے پہرے میں
ہم اتنی تنگی میں اس کو شراب کیا دیتے

منیر دشت شروع سے سراب آسا تھا
اس آئینے کو تمنا کی آب کیا دیتے

میں اگر ٹھہر جاتا

میں اگر ٹھہر جاتا
اس نظر کے کہنے سے
میں قیام کر لیتا
یوں سفر میں رہنے سے
اُس دیارِ غُربت کے
درد مند لوگوں میں
اپنے جیسے دنیا کے
فکر مند لوگوں میں

غزل

دشت باراں کی ہوا سے پھر ہرا سا ہو گیا
میں فقط خوشبو سے اس کی تازہ دم سا ہو گیا

اس کے ہونے سے ہوا پیدا خیالِ جاں فزا
جیسے اِک مُردہ زمیں میں باغ پیدا ہو گیا

پھر ہوائے عشق سے آشفتگی خوباں میں ہے
ان دنوں میں حسن بھی آزار جیسا ہو گیا

ہے کہیں محصور شاید وہ حقیقت عہد کی
جس کا رستہ دیکھتے اتنا زمانہ ہو گیا

غم رُبا ہے حال کہنا دل کا اس بُت سے منیرؔ
جس کے غم میں اپنے دل کا حال ایسا ہو گیا

ہر مکھ پر خوبصورتی کا مقام

ہر کسی کے چہرے میں
اِک ضیا سی ہوتی ہے
رُخ کے ایک حصّے میں
حسن کے علاقے کی
اِک ادا سی ہوتی ہے
اس کو مَیں نے دیکھا تھا
گرم خُو مہینوں میں
اِک خوشی کی محفل میں
شہر کے مکینوں میں
اِک طرف کھڑے تنہا
جس طرف کو رستے تھے
جن کے ساتھ گلیاں تھیں

جن میں لوگ بستے تھے
بے کشش مکانوں میں
جیسے چاند راتیں تھیں
اس کے سرد چہرے میں
خوشگوار آنکھیں تھیں

غزل

شکوہ کریں تو کس سے شکایت کریں تو کیا
اک رائیگاں عمل کی ریاضت کریں تو کیا

جس شے نے ختم ہونا ہے آخر کو ایک دن
اس شے کی اتنے دکھ سے حفاظت کریں تو کیا

حرفِ دروغ غالبِ شہرِ خدا ہوا
شہروں میں ذکرِ حرفِ صداقت کریں تو کیا

معنی نہیں منیرؔ کسی کام میں یہاں
طاعت کریں تو کیا ہے، بغاوت کریں تو کیا

ڈرائے گئے شہروں کے باطن

ان دنوں یہ حالت ہے میری خواب ہستی میں
پھر رہا ہوں میں جیسے اک خراب بستی میں
خوف سے مفر جیسے شہر کی ضرورت ہے
عیش کی فراوانی اس کی ایک صورت ہے
اِن دنوں میں مے نوشی فعلِ سود لگتا ہے
عورتوں کی صحبت میں دل بہت بہلتا ہے

ایک بیراگی سے مکالمہ

کیوں بیراگ لیا رے بھائی، کیوں بیراگ لیا
کس کارن اِن سُکھ کے دنوں میں
جگ کو تیاگ دیا
یہ ریکھائیں اور دِشائیں جن کا تجھ کو گیان نہیں
لے جائیں گی ایسی جگہ پر جس کی تجھے پہچان نہیں
تج دے گا جس دھرتی کو تو نے نیا سہاگ دیا

طلسماتِ صبحِ کاذب

کچھ اندھیرے کی خبر تھی کچھ اُجالے کی خبر
صبحِ صادق سے سوا تھا صبحِ کاذب کا اثر
اِک سیہ دیوار پر آثارِ روشن کی رمق
ظاہر باطل کے آگے نور کا چہرہ تھا فق

موسمِ سرما کی بارش کا یہ پہلا روز ہے

موسمِ سرما کی بارش کا یہ پہلا روز ہے
دھند ہے اطراف میں سورج کے خوابِ گرم پر
میں کہ جو محصور ہوں آرامِ حسنِ یار میں
اِک حفاظت سی ہے مجھ کو جسم کی مہکار میں
یاد اور موجود دونوں کی حقیقت اس میں ہے
غم کی طاقت کو غلط کرنے کی ہمت اس میں ہے
سحر اتنے ہیں جمالِ مہربانِ یار میں
جتنے اس سرما کی بارش کے حسیں اسرار میں

اب میں اسے یاد بنا دینا چاہتا ہوں

مَیں اس کی آنکھوں کو دیکھتا رہتا ہوں
مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا
مَیں اس کی باتوں کو سنتا رہتا ہوں
مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا
اب اگر وہ کبھی مجھ سے ملے
تو مَیں اس سے بات نہیں کروں گا
اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں
مَیں کوشش کروں گا
میرا دِل کہیں اور مبتلا ہو جائے
اب مَیں اسے یاد بنا دینا چاہتا ہوں

گہری خاموشی

جب سے وہ بچھڑا ہے
اس گھر کی خاموشی اس کی قبر سے بھی گہری ہے
اس کے گُن
روشن آنکھوں کی طرح یہاں منڈلاتے ہیں
اور چاندی سی آوازوں سے
دکھ کو دور بھگاتے ہیں ——— !

(میری دیب کی نظم کا ترجمہ)

غزل

خواب و خیالِ گُل سے کدھر جائے آدمی
اِک گلشن ہوا ہے جدھر جائے آدمی

دیکھے ہوئے سے لگتے ہیں رستے، مکاں، مکیں
جس شہر میں بھٹک کے جدھر جائے آدمی

دیکھے ہیں وہ نگر کہ ابھی تک ہوں خوف میں
وہ صورتیں ملی ہیں کہ ڈر جائے آدمی

یہ بحرِ ہست و بود ہے بے گوہرِ مراد
گہرائیوں میں اس کی اگر جائے آدمی

پردے ہیں رنگ و بو کے سفر در سفر منیر
ان منزلوں سے کیسے گزر جائے آدمی

غزل

پتھر کا اس کا دل ہے تو مخمل کا اس کا جسم
میداں ہے اس کی آنکھ میں، بادل کا اس کا جسم

شاید نظر پڑے جو درِ روشنی کھُلے
اتنی سیاہ رات میں کاجل کا اس کا جسم

موسم کی سختیوں میں اسے دیکھنا ذرا
ٹھنڈی ہوا کی زد پہ ہے پیپل کا اس کا جسم

تازہ ہوئی ہے اس کے سبب روحِ عصر بھی
پھُوٹا ہے ایسے رنگ سے کونپل کا اس کا جسم

تبدیلیوں کے دن ہیں زمانے میں اے منیرؔ
ہے آج مختلف سا بہت، کل کا اس کا جسم

غزل

اپنے گھر سے چل پڑنا محفلوں کی حسرت میں
راستوں میں رہ جانا منزلوں کی حسرت میں

دیر تک کھڑے رہنا باغ کے اندھیرے میں
دیر سے جُدا رہتے دلبروں کی حسرت میں

اس کی بے وفائی بھی مستقل نہیں ہوتی
دل سدا وہ رکھتا ہے دوزخوں کی حسرت میں

کُوک ہے یہ کوئل کی یا پکار ازلوں سے
انت کی اداسی کی رونقوں کی حسرت میں

ضد منیرؔ کیوں ٹھہرے حال کے زمانے کی
اور اک زمانے کے موسموں کی حسرت میں

(اپنی پنجابی غزل کا ترجمہ)

اُس کو یاد کرنے کی ساعتیں

جب تارے واپس جانے لگیں
آثار سحر کے آنے لگیں،
اس وقت اسے تم یاد کرو
اور رات کے کسی علاقے میں
اور شام کے خالی خاکے میں

آغازِ زمستاں میں دوبارہ

مُنیر نیازی

انتساب

والدِ مرحوم فتح محمدؐ خان نیازی کے نام

ترتیب

غزل

سورج کی دمک بجلی کی چمک ساون کا ہرا بن دیکھا ہے
رنگین ملائم پتوں کی سرسر سے بھرا بن دیکھا ہے

دیوارِ فلک، محرابِ زماں، سب دھوکے آتے جاتے ہوئے
یہ ایک حقیقت ہم پہ کھلی جب سے وہ کھلا بن دیکھا ہے

میراثِ جہاں اک عہدِ وفا کسی خواب میں زندہ رہنے کا
اک قصۂ تنہا آدم کا جس نے تنہا بن دیکھا ہے

کبھی بابِ ہوا کبھی سبز ردا، کبھی راز ہزاروں صدیوں کا
ہر لمحہ رنگ بدلتا ہوا ہر آن نیا بن دیکھا ہے

دیکھا ہے اُسے اُس گھر میں مگر لگتا ہے منیرؔ ایسا مجھ کو
دریا کے کنارے پر جیسے پانی میں گھرا بن دیکھا ہے

غزل

دل کا سفر بس ایک ہی منزل پہ بس نہیں
اتنا خیال اُس کا ہمیں اِس برس نہیں

دیکھو گُلِ بہار اثر دشتِ شام میں
دیوار و در کوئی بھی کہیں پیش و پس نہیں

آیا نہیں یقین بہت دیر تک ہمیں
اپنے ہی گھر کا در ہے یہ بابِ قفس نہیں

ایسا سفر ہے جس کی کوئی انتہا نہیں
ایسا مکاں ہے جس میں کوئی ہم نفس نہیں

آئے گی پھر بہار اسی شہر میں منیر
تقدیر اِس نگر کی فقط خار و خس نہیں

غزل

جو مجھے بھلا دیں گے میں انھیں بھلا دوں گا
سب غرور ان کا میں خاک میں ملا دوں گا

دیکھتا ہوں سب شکلیں سن رہا ہوں سب باتیں
سب حساب ان کا میں ایک دن چکا دوں گا

روشنی دکھا دوں گا ان اندھیر نگروں میں
اک ہوا ضیاؤں کی چار سو چلا دوں گا

بے مثال قریوں کے بے کنار باغوں کے
اپنے خواب لوگوں کے خواب میں دکھا دوں گا

میں منیرؔ جاؤں گا ایک دن اسے ملنے
اس کے در پہ جا کے میں ایک دن صدا دوں گا

غزل

صبحِ خنداں غمِ شبانہ تھا
وہ حقیقت تھا یا فسانہ تھا

اُس کو دیکھا نہ اُس سے بات ہوئی
ربط جتنا تھا غائبانہ تھا

ہم نے وہ وضع جو بنالی تھی
اُس سے ملنے کا اِک بہانہ تھا

اُس طرف یاد تھی عظیم و کبیر
درمیاں میں بہت زمانہ تھا

ہم بھی آئے منیرؔ ہستی میں
رسم تھی اِک جسے نبھانا تھا

غزل

دل کو حالِ قرار میں دیکھا
یہ کرشمہ بہار میں دیکھا

جس کو چاہا خمار میں چاہا
جس کو دیکھا غبار میں دیکھا

خواہشوں کو بہت ہوا دینا
وصف یہ ہم نے یار میں دیکھا

اک بشر میں کئی بشر دیکھے
جزو کُل کے حصار میں دیکھا

جب سے دیکھا ہے اس زمیں کو منیرؔ
قیدِ لیل و نہار میں دیکھا

غزل

روشنی در روشنی ہے اُس طرف
زندگی در زندگی ہے اُس طرف

جن عذابوں سے گزرتے ہیں یہاں
ان عذابوں کی نفی ہے اس طرف

اِک رہائش خواہشِ دل کی طرح
اِک نمائش خواب کی ہے اس طرف

جو بکھر کر رہ گیا ہے اِس جگہ
حُسن کی اک شکل بھی ہے اس طرف

جستجو جس کی یہاں پر کی منیر
اُس سے ملنے کی خوشی ہے اُس طرف

غزل

ابرِ بہارِ شامِ تمنا بھی خواب ہے
یہ انتظارِ حُسنِ دلآرا بھی خواب ہے

ہیں خواب قصّہ ہائے فراق و وصال سب
میرے اور اُس کے غم کا فسانہ بھی خواب ہے

گزرے ہُوئے زمان و مکاں جیسے خواب تھے
سحرِ خیالِ عشرتِ فردا بھی خواب ہے

بس ایک خواب نورِ سحر کے مقام کا
اس خوابِ تلخِ شب کا مداوا بھی خواب ہے

ملتا ہوں روز اس سے اِسی شہر میں منیرؔ
پر جانتا ہوں وہ بتِ زیبا بھی خواب ہے

غزل

محفل آرا تھے مگر پھر کم نما ہوتے گئے
دیکھتے ہی دیکھتے ہم کیا سے کیا ہوتے گئے

ناشناسی دہر کی تنہا ہمیں کرتی گئی
ہوتے ہوتے ہم زمانے سے جُدا ہوتے گئے

منتظر جیسے تھے در شہرِ فراق آثار کے
اک ذرا دستک ہوئی در دم میں وا ہوتے گئے

حرف پردہ پوش تھے اظہارِ دل کے باب میں
حرف جتنے شہر میں تھے حرفِ لا ہوتے گئے

وقت کس تیزی سے گزرا روزمرّہ میں منیرؔ
آج کل ہوتا گیا اور دن ہوا ہوتے گئے

غزل

ساعتِ ہجراں ہے اب کیسے جہانوں میں رہوں
کن علاقوں میں بسوں میں کن مکانوں میں رہوں

ایک دشتِ لامکاں پھیلا ہے میرے ہر طرف
دشت سے نکلوں تو جا کر کن ٹھکانوں میں رہوں

علم ہے جو پاس میرے کس جگہ افشا کروں
یا ابد تک اس خبر کے رازدانوں میں رہوں

وصل کی شامِ سیہ اس سے پرے آبادیاں
خواب دائم ہے یہی میں جن زمانوں میں رہوں

یہ سفر معلوم کا معلوم تک ہے اے منیرؔ
میں کہاں تک ان حدوں کے قید خانوں میں رہوں

غزل

رنگوں کی وحشتوں کا تماشا تھی بامِ شام
طاری تھا ہر مکاں پہ جلالِ دوامِ شام

گلدستۂ جہات تھا نیرنگِ راہِ عشق
تھا اِک طلسمِ حُسن خیابانِ دامِ شام

آگے کی منزلوں کی طرف شام کا سفر
جیسے شبوں کے دل میں تھا شہرِ قیامِ شام

باندھے ہوئے ہیں وقت سبھی اس کے حکم میں
ہے جس خدا کے ہاتھ میں کارِ نظامِ شام

دھندلا گئی ہے شام شبِ خام سے منیرؔ
خالی ہوا کشش کی شرابوں سے جامِ شام

غزل

بے حقیقت دوریوں کی داستاں ہوتی گئی
یہ زمیں مثلِ سرابِ آسماں ہوتی گئی

کس خرابی میں ہوا پیدا جمالِ زندگی
اصل کس نقلِ مکاں میں رائیگاں ہوتی گئی

تنگیٔ امروز میں آئندہ کے آثار ہیں
ایک ضد بڑھ کر کسی سکھ کا نشاں ہوتی گئی

دوسرے رُخ کا پتہ جس کو تھا وہ خاموش تھا
وہ کہانی بس اُسی رُخ سے بیاں ہوتی گئی

اِک صدا اُٹھی تو اِک عالم ہُوا پیدا منیرؔ
اِک کلی مہکی تو پورا گلستاں ہوتی گئی

رات دن کے بدلتے آئینے میں ایک مقامِ شکر

ہوا چلتی ہے وسعت کے خیابانوں کی حیرت میں
ہوا چلتی ہے مغرب کے پری خانوں کی غربت میں
ہوا چلتی ہے قریے کے شبستانوں کی حالت میں
ہوا چلتی ہے سرما کی نئی شامِ محبّت میں
کوئی دیرینہ دکھ ہے در و بامِ محبّت میں
کوئی کیفیتِ فردا ہے مہتابِ تمنّا میں
مقام ایسا کبھی دیکھا نہیں خوابِ تمنّا میں
یہ کیسی شام آئی ہے مجھے بابِ تمنّا میں

نئے ستارے کے آس پاس بنتے بگڑتے دن

کئی دن سے اک ستارہ
کیے جا رہا ہے مجھ کو
کسی بات کا اشارہ
دمِ انتظارِ شب میں
کوئی چشمِ مست جیسے
سرِ پردۂ نگاریں
غمِ بود و ہست جیسے
کسی شہرِ رفتگاں پر
خمِ خوابِ زر فشاں پر
دلِ ناصبور جیسا
کسی دوسرے جہاں پر
کسی اور آسماں پر
کسی شامِ نور جیسا

جگنو چمک رہا ہے

جگنو چمک رہا ہے
جگنو بھٹک رہا ہے
سحرِ سیاہِ شب میں
املی کی ڈالیوں میں
خوابیدہ در کے باہر
لکڑی کی جالیوں میں
تنہا نگاہِ شب میں
مثلِ خیالِ روشن
خوابِ سیاہِ شب میں
جگنو چمک رہا ہے

وصالِ سرسبز

پھُول اِک گلاب کا
مضمحل، خراب سا
اس خراب پھُول پر
تیتری کے پنکھ ہیں
چادریں حجاب کی
محرمِ حجاب پر
دیر پا وصال کے
دُور تک کے خواب کی
جس کی شش جہات سے
پھُوٹتی ہیں پتیاں
اِک نئے گلاب کی

حوصلہ دینے والی مثال

دیکھو کیسے گرا وہ
دیکھو کیسے اُٹھا وہ
کتنا اسفل ہُوا تھا
کتنا افضل ہُوا وُہ
تنہا جتنا رہا وہ
کثرت جتنا رہا وہ
اس کی طرح بنو تم
اس کے ساتھی بنو تم
دیکھو کیسے اُٹھا وہ
کتنا افضل ہُوا وہ

فیصل آباد زرعی یونیورسٹی میں ایک روشن دن

لال سنہرے رنگ کے نیچے ہرے رنگ کے بھتال ہیں
تین شجر یہ رنگ اٹھائے کھڑے مئی کی دُھوپ میں
ہجر ہی ہجر کی حد پر جاگے خواب کی کوئی مثال ہیں

تین بشر مسحور کھڑے ہیں دُھوپ کے روشن روپ میں
جیسے یہ کسی نئے جنوب کا کوئی نیا شمال ہیں
جیسے اس کے نئے مکان کا کوئی نیا جمال ہیں

کیسے پھر اس عہد کو زندہ کروں

میں محبت کس طرح اس سے کروں
دل میں جو ہے کس طرح اس سے کہوں

میرے اس کے درمیاں بیگانگی برسوں کی ہے
ایک بے مفہوم جیسی خامشی برسوں کی ہے

اپنی اپنی زندگی میں مبتلا اتنے رہے
سارا کچھ دھندلا گیا ہے ہم جدا اتنے رہے

اس کے کس رخ کو اشارہ عشق کا کیسے کروں
اس ذرا سے کام کی میں ابتدا کیسے کروں

اے بادل

اے بادل جب بیل بنے تُو
موتی کنٹھ کے پھُولوں کی
جب آکاش پہ رنگت ہو تُو
مینہ کے بعد کے جھُولوں کی

اے بادل جب بوند بنے تُو
تالابوں کے پانی پر
خواہش سے بھی تنگ جگہ پر
وسعت کی ویرانی پر

اے بادل جب شکل بنے تُو
آدمیوں کی بستی کی
اس کے کسی آباد مکاں میں
میرے جیسی ہستی کی

اے بادل جب وقت بنے تو
تیری شام کوئی بھی ہو
میں پہچان سکوں گا تجھ کو
تیرا نام کوئی بھی ہو

ہجرت اور مراجعت کی حدود پر

کچھ دیر مَیں تم سے دُور رہوں گا پھر واپس آ جاؤں گا
تم میں بھی ابھی وہ بات نہیں جو مُجھ کو یہاں پہ روک سکے
مجھ میں بھی ابھی وہ بات نہیں جو تم کو یہاں پہ روک سکے
اس بات کی کچھ دن کھوج کروں گا پھر واپس آ جاؤں گا

خواب اتنے دیکھتا ہوں

رات بھر میں جاگتا ہوں اُس خدا کی یاد میں
جس کا دم آباد ہے اس قریۂ برباد میں

مینہ کی خوشبوئیں جیسے دشتِ ہُو کی پیاس میں
دن گزر جاتا ہے میرا اُن دنوں کی آس میں

چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں شہر سے اُڑتے ہوئے
جنّتوں سے رنگ مِلتے، ٹوٹتے، جُڑتے ہوئے

رات دن رہتا ہوں اِن کی سبز شادابی میں مَیں
خواب اتنے دیکھتا ہوں اپنی بے خوابی میں مَیں

وقت سے آگے گزرنے کی سزا

آدمی تنہا رہ جاتا ہے

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

شہر کے مکان

اپنے ہی ڈر سے جُڑے ہُوئے ہیں
اِک دُوجے کے ساتھ

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

برسوں کے بعد مُلاقات

پہلے تو میں گزر گیا یونہی جیسے کوئی انجان
پھر میں اسے پہچان کے ہوا بہت حیران

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

نئی رُت

ہلکی ہلکی ٹھنڈ میں کانپیں
خواہشیں چھُپے ہوئے پیار کی
راتیں چیت بہار کی
لے کر آئیں ساتھ ہوائیں
سات سمندر پار کی

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

سانپ کی صفات

سُر ہو تو وہاں پر سانپ
مہک ہو تو وہاں پر سانپ
زیرِ زمیں کی تاریکی میں
زر ہو تو وہاں پر سانپ

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

اصل سے خوف

اِدھر اُدھر کرتے رہتے ہیں
اصل سے ہیں ہم ڈرتے
جس سے بات ہے کرنی ہوتی
اُسی سے ہم نہیں کرتے

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

شہرِ اوہام

بُت کدے میں بُت بہت ہیں مسندوں پر تخت پر
وہم کی تجسیم سنگیں اب ہے اوجِ بخت پر
سینکڑوں سالوں کا پہرا مستقل اس در پہ ہے
دیر کے کچھ خوف ہیں دیوارِ شہرِ سخت پر

غزل

بادل اُڑے تو گم آسمان دکھائی دیا
پانی اُترے تو اپنا مکان دکھائی دیا

اُس سے آگے فراق کی منزلیں تھیں
جہاں پہنچ کے اس کا نشان دکھائی دیا

اُس کے سامنے یہ جگ ویران لگا
اُس کی آنکھوں میں ایسا جہان دکھائی دیا

ہمارے حال کی خبر وہ رکھتا تھا
ساری عمر جو انجان دکھائی دیا

کام وہی منیرؔ تھا مشکلوں کا
جو شروع میں بہت آسان دکھائی دیا

(اپنی پنجابی غزل کا ترجمہ)

جامنی رنگ کا کرشمہ

جامنی پنچھی جامنی پھول
جامنی حدیں جامنی ہونٹ
تک کے گئیں یہ آنکھیں بھول
پچھلی دید کے سارے دکھ
یاد آئے کبھی بھولے سکھ

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

یہ رستے یہ لمبے رستے
کونسی سمت کو جاتے ہیں
بہت پُرانے محلوں اندر
بچھڑے یار ملاتے ہیں
اُونچے، گھرے جنگلوں اندر
شیر کی طرح ڈراتے ہیں
یا پھر یونہی گھوم گھما کے
واپس موڑ لے آتے ہیں

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

میرا اصل وُجود

میرا تو بس اتنا ہی کچھ ہے
حصّہ اپنے آپ کے بیچ
جتنا رات کے سُننے والے کا
بھاری پیر کی چاپ کے بیچ

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

ایک بہاری رات

گھر کی دیواروں پر دیکھو بوندیں لال پھوار کی ہیں
آدھی شب دروازے کھڑکیں ڈائنیں چیخیں مارتی ہیں
سانپ کی شوکر گونجے جیسے باتیں گھر سے پیار کی ہیں
اِدھر اُدھر چھُپ چھُپ کر ہنستی شکلیں شہر سے پار کی ہیں
پاس سے روح سمان گزرتی مہکیں باسی ہار کی ہیں
گورستان کی راہ دکھاتی کوکیں پہرے دار کی ہیں

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

حرفِ سحر خیز

شاید وُہ آ ہی جائے
سوچا تھا جس کو مَیں نے
پیڑوں میں چھُپ کے بیٹھی
گُلدم کی راگنی میں
بے چین گھر کے اندر
صُبحِ جہاں نما کی
تاریک بے کلی میں
شاید میں اس سے مل کے
وہ بات کہہ سکوں گا
جس بات کو کہا تھا
مَیں نے کبھی کسی سے
ایسی ہی اک سحر میں
اِک اجنبی نگر میں
اِک اور اجنبی سے

غزل

دل کو اپنی ہستی کا چارہ گر بنا لیتے
ہم جو اُس سے مل جاتے اِک نگر بنا لیتے

دربدر نہ میں پھرتا دربدر نہ وہ ہوتا
اک جگہ پہ مل کے جو اپنا در بنا لیتے

خواب جو نہ بن جاتے نیند کے جہانوں میں
یہ عذاب دنیا کے دل میں گھر میں بنا لیتے

اب خیال آتا ہے منزلوں کی سختی میں
کوئی یار تو اپنا ہم سفر بنا لیتے

راہ بر کے بن چلنا اے منیرؔ مشکل تھا
پر خراب ہوتے جو راہ بر بنا لیتے

(اپنی پنجابی غزل کا ترجمہ)

غزل

کارِ دنیا تھا سخت کام طلب
ہم تھے آرام اور نام طلب

اس صدا کی جہت نہیں کوئی
شورشِ دہر ہے نظام طلب

ایک بے مہر دن کے آخر پر
شام آئی ہے کیسی جام طلب

اور ہستی کی جستجو سی ہے
ساری ہستی ہے ناتمام طلب

عارضی تھا مقام اپنا منیرؔ
خواہشِ زیست تھی دوام طلب

راولپنڈی میں شروع سال کی بارش

ناہموار مکانوں میں
کھلتے ہوئے دریچوں سے
تکتے ہوئے حسینوں پر
ناہموار پہاڑوں سے
ناہموار زمینوں پر
وسعت بھری دراڑوں سے
پتھریلی ڈھلوانوں پر
چڑھتے ہوئے مکینوں پر
وقت کے ہرے کواڑوں سے
سال کے نئے مہینوں پر

وداع

رُخ کدھر ہے حُسن کا
اس حُسنِ بے پرواہ کا
وسعتِ کون و مکاں میں
مرکزِ غم کی طرف

سُورج گرہن کے دن

بامِ بلندِ غم سے
موسم گزُر رہے ہیں

اِک اِک صدی کا لمحہ
رفتار تیز ایسی
باتیں سمجھ نہ آئیں
گفتار تیز ایسی

بننے سے پیشتر ہی
منظر بکھر رہے ہیں

انہونیاں بہت ہیں
ان موسموں کے اندر
جن کا گماں نہیں ہے
وہ برق وش منازل
ہیں ان رُتوں کے اندر

اِک سمت میں کہیں پر
شب ریز ساعتوں میں
رستہ دکھانے والی
اِک شے چمک رہی ہے

اِک سمت میں کہیں پر
صدیوں کی کج روی میں
گم راہ آدمی کی
کوشش بھٹک رہی ہے

واہمے

واہمہ ہے یہ سمندر شامِ ساحل کی طرح
دس برس پہلے کی چاہت کی حقیقت کی طرح
باغ میں اُس کی رفاقت آسمانِ شب تلے
گرمیوں میں ہاتھ اُس کا روشنی کا جال سا
دو اندھیروں میں گھرے اِک دائمی سے حال سا
دو زمانوں کے اثر میں رنگِ ماہ و سال سا
واہمہ ہے یہ سمندر اُس محبت کی طرح

ساعتِ سیّار

منیر نیازی

ترتیب

منیر نیازی کے کلام پر جرح و تعریف سے قریب
قریب سبھی مروّجہ الفاظ کہے اور لکھے جا چکے ہیں۔ اب
تو یہی کہنا کافی ہے کہ منیر نیازی کا مجموعہ ان کے
مداحوں اور چاہنے والوں کے لئے جنت نگاہ اور
فردوس گوش کا سامان لے کر آتا ہے، ان کو حرز دہ
ہو نہ باعث ستائش کی صورت میں ایک اور دلکش و قیع
ان کی صفات کے حسن کے لئے وارد ہوا ہے تو منیر نیازی کے کلام
حروف اور مصارف سے تعلق ہے۔ زبان و اظہار کی سادگی و پرکاری
جذبات و افکار کا خلوص اور دردمندی، منیر کی ذات کی طرح ان ابیات
میں قلندرانہ طنطنہ اور بے نیازی بھی ہے، تفکرانہ تجسس اور دلسوزی
بھی۔ پنجابی منظومات کا اردو ترجمہ ایک دلچسپ اضافہ ہے جس کے لئے
منیر پنجابی شائقین کے شکر گزار ہوں گے اور اس مجموعے کے مطالعے

کہ بعض قارئین کو منیر سے کوئی شکایت پیدا ہوگی

تو غالباً یہی کہ یہ کتاب اس قدر مختصر کیوں ہے

منیر نیازی

۲۳

والدہ مرحومہ بی بی رشیدہ بیگم کے نام

سلام

خوابِ جمالِ عشق کی تعبیر ہے حسینؑ
شامِ ملالِ عشق کی تصویر ہے حسینؑ

حیراں وہ بے یقینیٔ اہلِ جہاں سے ہے
دنیا کی بے وفائی سے دلگیر ہے حسینؑ

یہ زیست ایک دشت ہے لاحد و بے کنار
اس دشتِ غم پہ ابر کی تاثیر ہے حسینؑ

روشن ہے اس کے دم سے الم خانۂ جہاں
نورِ خدائے عصر کی تنویر ہے حسینؑ

ہے اس کا ذکر شہر کی مجلس میں رہنما
اجڑے نگر میں حسرتِ تعمیر ہے حسینؑ

والدہ مرحومہ کی یاد میں

وسیع میدانوں میں
جہاں سے کوئی نہیں گزرتا
وہ وہاں موجود ہے۔

میں جن راستوں پر
کسی خوف سے نہیں جا سکتا
وہ وہاں موجود ہے

میں نے جن مکانوں میں
زندگی کے اچھے یا بُرے دن کاٹے ہیں
وہ وہاں موجود ہے

غیب میں جو باغات ہیں
ابرِ رحمت جن پر پھوار کی طرح برستا ہے
وہ وہاں موجود ہے۔

والد مرحوم کی یاد میں

کل میں تنہائی سے ڈر کر
اس کو ڈھونڈنے نکلا،

لاہور ٹاؤن شپ پر نظم

جس شہر میں رہا میں برسوں کی زندگی میں
کاٹی حیات جس میں شرمندہ خامشی میں
اس شہر کی حدوں پر میں گھر بنا رہا ہوں
ماہِ منیر جس پر شب گیر ہو رہا ہے
اک شہر ساتھ میرے تعمیر ہو رہا ہے
میرے مکاں سے آگے میداں کہیں کہیں پر
آبادیاں کہیں پہ، خالی زمیں کہیں پر
ایک بڑھ کا پیڑ جو اب کچھ پیر ہو رہا ہے
جگمگ دکاں سے ملتے سنسان راستے پر
اک لالٹین والے تنور کے سرے پر
اک مرد اور عورت اک سوچ میں کھڑے ہیں
وحشی غزال جیسے زنجیر ہو رہا ہے

خواب میری پناہ ہیں

بس مرا چلتا نہیں جب سختیٔ ایام پہ
فتح پا سکتا نہیں جب یورشِ آلام پہ
اپنے ان کے درمیاں دیوار چن دیتا ہوں میں
اس جہانِ ظلم پر اک خواب بُن دیتا ہوں میں

آج میں کل کا دخل

کھیل دھوپ چھاؤں کا
بادلوں ہواؤں کا
صحنِ صبحِ نَو میں ہے
وہ قدیم راستے
شہرِ وہ خیال کے
حُسن جن کا دُور سے
تھا سفر میں پارسا
اُن کی اک جھلک بھی ہے
سامنے کی دید میں
اِس نویدِ عید میں
آج کے قرار میں
آنے والے دَور کے
خوش نما غبار میں
اُن کی اک مہک بھی ہے
چاہتوں کے سال میں
حجلۂ وصال سی
آج کی بہار میں

اس کے باہر صرف ڈر ہے رات کے ہنگام کا

اک دھندلکا صبح کا ہے اک دھندلکا شام کا
اور ان کے درمیاں دن کارِ بے آرام کا
سانس لینے ہی نہیں دیتا یہ وقفہ کام کا

کچھ ذرا فرصت ملے تو یاد آئے یار بھی
اس کی صحبت میں جو تھی وہ ساعتِ سیّار بھی
دو حدوں پر ہے جو قائم وہ درِ دلدار بھی

میری ہستی میں بھی آئے ایک دن آرام کا
ایک دھندلی صبح کا اور ایک دھندلی شام کا

نئی تعمیر میں ایک جدائی کی کیفیت

خلائی ہاتھ، چق اور چق کے پیچھے
طلسماتِ درِ خوباں نہیں ہیں
وہ رستے اب نہیں باقی مکاں میں
نئی تعمیر میں گلیاں نہیں ہیں

اے سرآرائے اورنگِ حسن

اِک بے رُخی سی رابطۂ محبت میں ہے کہیں
اِک شک کا روگ شوق کی جنت میں ہے کہیں

کیا بات اُس کے دِل میں ہے کہتا نہیں کوئی
الجھن ہے کس طرح کی بتاتا نہیں کوئی

بس چُپ سی لگ گئی ہے جوانانِ شہر کو
کچھ ہو گیا ہے رُوحِ خیابانِ شہر کو

ہر اہلِ دل کو جان سے بیزار کر دیا
تو نے تو یارِ شہر کو بیمار کر دیا

کوئی زمانہ ہو

کوئی زمانہ ہو کوئی شہر ہو
میں اسی طرح ان سے گزرتا رہتا ہوں
اسی رفتار سے
مضافات کے کچے راستے ہوتے ہیں
اور شام پڑنے کے قریب کا وقت
مجھے کہیں جانا ہے
بس یہی دھیان مجھے رہتا ہے
میرے دور دور تک آشیاں کی طرف لوٹتا پرندہ
کوئی اور راہرو نہیں ہوتا
کوئی زمانہ ہو کوئی شہر ہو

موسم نے ہم کو منظر کی طرح پریشان کر دیا ہے

کہیں پر ایک آبادی کا ٹکڑا ہے
اور کہیں پر سبز قطعہ اراضی
خالی زمین کا ایک وسیع رقبہ ہے
جس پر رات کی بوندا باندی کے نشان ہیں
اس رقبے پر دو حاملہ عورتیں چلی جا رہی ہیں
ایک خاموش خاموش ہے ایک شوخ اور ہنس مکھ
ایک آدمی اُن سے کچھ فاصلے پر اُن کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے
ایک طرف درختوں کے جھنڈ ہیں
ایک خانقاہ کے آثار ہیں
دوسری طرف سرسوں کے کھیت کی پیلاہٹ کی مہک

موسم ہے رنگیلا، گیلا اور ہوادار

موسم ہے رنگیلا، گیلا اور ہوادار
گلشن ہے بھڑکیلا، نیلا اور خوشبودار
عورت ہے شرمیلی، پیلی اور طرحدار
اس کی آنکھیں ہیں چمکیلی، گیلی اور مزیدار

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں مَیں ہر کام کرنے میں
ضروری بات کہنی ہو کوئی وعدہ نبھانا ہو
اسے آواز دینی ہو اسے واپس بلانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں

مدد کرنی ہو اس کی، یار کی ڈھارس بندھانا ہو
بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں

بدلتے موسموں کی سیر میں دل کو لگانا ہو
کسی کو یاد رکھنا ہو کسی کو بھول جانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں

کسی کو موت سے پہلے کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ اس کو جا کے یہ بتانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں

میں بھی کسی خیال سے کچھ رُک گیا وہاں

دیکھی ہوئی جگہ تھی کسی گزرے دور کی
میری صدا کے ساتھ صدا ایک اور تھی
آغازِ عہدِ سرد کے پت جھڑ کی شام تھی
بس اتنی بات یاد رہی اس مقام کی

یہ گزرتے دن ہمارے

نرم بوندوں میں مسلسل بارشوں کے سامنے
آسماں کے نیل میں کومل سُروں کے سامنے
یہ گزرتے دن ہمارے پنچھیوں کے روپ میں
تنگ شاخوں میں کبھی خوابیدگی کی دھوپ میں
ہیں کبھی اوجھل کبھی سُکھ کی حدوں کے سامنے
چہچہاتے، گیت گاتے بادلوں کے شہر میں
کوئے جاناں کی ہوا میں گل رخوں کے شہر میں
اک جمالِ بے سکوں کی حسرتوں کے سامنے
سبز میدانوں میں، بنوں میں، کوہساروں میں کبھی
زرد پتوں میں کبھی، اجلی بہاروں میں کبھی
قیدِ غم میں یا کھُلی آزادیوں کے سامنے

گیت

نہیں ہے رُت یہ ملنے کی وہ موسم اور ہی ہوگا
ترے آنے کی گھڑیوں کا وہ عالم اور ہی ہوگا

کوئی مدھم مہک آ کر گلے کا ہار بنتی ہے
اداسی ہجر کی جیسے وصالِ یار بنتی ہے
ترے پھولوں سے ہونٹوں پر تبسم اور ہی ہوگا

جہاں جس میں رفاقت کی خوشی محسوس ہوتی ہے
محبت جس میں ہر شے دائمی محسوس ہوتی ہے
ہمارے حال کے رازوں کا محرم اور ہی ہوگا

دن کی دوڑ دھوپ کے بعد

آرام بزمِ شام کی گنجائشیں بھی ہیں
کارِ جہاں کے بعد کی آسائشیں بھی ہیں
ہیں رونقیں بھی محفلِ یارانِ شہر میں
قصرِ بتاں میں حسن کی آرائشیں بھی ہیں

جس کے آگے حد کھڑی ہے راستہ مسدود ہے
اس بلا کے شہر میں وہ شہر بھی موجود ہے
جس کی حسرت میں بتا دی عمر ساری اے منیرؔ
منتظر شاہد کا نقشِ تازہ مشہود ہے

بلاتی ہے جو پاس اپنے کچھ ایسی تھی ادا تم میں
تمہارے ہی اشارے سے ہوئے ہم مبتلا تم میں
بہت کچھ یاد آیا تھا تمہاری مسکراہٹ سے
وہ رُت تھی چڑھتے سالوں کی کشش تھی بے بہا تم میں

اِک دن رہیں بسنت میں

اِک دن رہیں بسنت میں
اِک دن جئیں بہار میں
اِک دن پھریں بے انت میں
اِک دن چلیں خمار میں
دو دن رُکیں گرہست میں
اک دن کسی دیار میں

چاہی تھی جیسی میں نے انہی الجھنوں کی ہے
جس زندگی میں ہوں وہ مری خواہشوں کی ہے
ہوں اس میں قید، جبرِ پرستش میں اے مُنیرؔ
درگاہ سی جو وہم سے پیدا بتوں کی ہے

بوجھ بے معنی سوالوں کے اٹھا رکھے ہیں
ہم نے سو فکرِ دل و جاں کو لگا رکھے ہیں
شہر جو ہوش کی تصویر بنے رہتے ہیں
وحشتِ فکر نے دیوانے بنا رکھے ہیں

اداسی کو بیاں کیسے کروں مَیں
خموشی کو زباں کیسے کروں مَیں
بدلنا چاہتا ہوں اِس زمیں کو
یہ کارِ آسماں کیسے کروں مَیں

عبوری دَور کا سٹیج

اس کا نقشہ ایک بے ترتیب افسانے کا تھا
یہ تماشا تھا یا کوئی خواب دیوانے کا تھا
سارے کرداروں میں بے رشتہ تعلق تھا کوئی
ان کی بے ہوشی میں خدشہ ہوش آجانے کا تھا

غزلیں

غزل

ہے میرے گرد کثرتِ شہرِ جفا پرست
تنہا ہوں اس لیے ہوں میں اتنا انا پرست

صحنِ بہارِ گُل میں کفِ گل فروش ہے
شامِ وصالِ یار میں دستِ حنا پرست

تھا ابتدائے شوق میں آرامِ جاں بہت
پر ہم تھے اپنی دُھن میں بہت انتہا پرست

بامِ بلندِ یار پہ خاموشیاں سی ہیں
اس وقت وہ کہاں ہے وہ یارِ ہوا پرست

گمراہیوں کا شکوہ نہ کر اب تو اے مُنیرؔ
تو ہی تھا سب سے بڑھ کے یہاں رہنما پرست

غزل

زور پیدا جسم و جاں کی ناتوانی سے ہُوا
شور شہروں میں مسلسل بے زبانی سے ہُوا

دیر تک کی زندگی کی خواہش اس بت کو ہیں
شوق اس کو انتہا کا عمرِ فانی سے ہُوا

میں ہوا ناکام اپنی بے یقینی کے سبب
جو ہُوا سب میرے دل کی بدگمانی سے ہُوا

ہے نشاں میرا بھی شاید شش جہاتِ دہر میں
یہ گماں مجھ کو خود اپنی بے نشانی سے ہُوا

تھا مُنیرؔ آغاز ہی سے راستہ اپنا غلط
اس کا اندازہ سفر کی رائگانی سے ہُوا

غزل

جتنے دن اُس بت کو اپنا غم سنانے میں لگے
سال کتنے اِن دلوں کے آنے جانے میں لگے

راستے ہی راستے تھے آخرِ منزل تلک
رنج کتنے اک خوشی کا خواب آنے میں لگے

یاد آئی صبح کوئی ابتدائے عمر کی
وہ گلِ تازہ کی صورت مسکرانے میں لگے

ہے بسنت آنے کو اڑتی پھر رہی ہیں باغ میں
تتلیوں کو رنگ کیسے اِس زمانے میں لگے

کس محبت سے ہُوا تعمیر مُدت میں مُنیرؔ
چند لمحے جس نگر کی خاک اُڑانے میں لگے

غزل

اتنے خاموش بھی رہا نہ کرو
غمِ جُدائی میں یوں کیا نہ کرو

خواب ہوتے ہیں دیکھنے کے لیے
اُن میں جا کر مگر رہا نہ کرو

کچھ نہ ہوگا گلہ بھی کرنے سے
ظالموں سے گلہ کیا نہ کرو

اُن سے نکلیں حکایتیں شاید
حرف لکھ کر مٹا دیا نہ کرو

اپنے رتبے کا کچھ لحاظ مُنیرؔ
یار سب کو بنا لیا نہ کرو

غزل

خیال کیتا ہیں خواب اتنے
سوال تنہا جواب اتنے

کبھی نہ خوبی کا دھیان آیا ،
ہوئے جہاں میں خراب اتنے

حساب دینا پڑا ہمیں بھی
کہ ہم جو تھے بے حساب اتنے

بس اک نظر میں ہزار باتیں ،
پھر اس سے آگے حجاب اتنے

مہک اٹھے رنگِ سُرخ جیسے
کھلے چمن میں گلاب اتنے

مُنیرؔ آئے کہاں سے دل میں
نئے نئے اضطراب اتنے

غزل

کسی خوشی کے سراغ جیسا
وہ رُخ ہے ہستی کے باغ جیسا

بہت سے پردوں میں نور جیسے
حجابِ شب میں چراغ جیسا

خیال جاتے ہوئے دنوں کا
ہے گم حقیقت کے داغ جیسا

اثر ہے اس کی نظر کا مجھ پر
شرابِ گل کے ابارغ جیسا

منیرؔ تنگی میں خواب آیا
کھلی زمیں کے فراغ جیسا

غزل

کھل گئے ہیں بہار کے رستے
ایک دلکش دیار کے رستے

ہم بھی پہنچے کسی حقیقت تک
اک مسلسل خمار کے رستے

منزل عشق کی حدوں پر ہیں
دائمی انتظار کے رستے

اس کے ہونے سے یہ سفر بھی ہے
سارے رستے ہیں یار کے رستے

جانے کس شہر کو منیرؔ گئے
اپنی بستی کے پار کے رستے

غزل

افق کو افق سے ملا دینے والے
یہ رستے ہیں کتنے تھکا دینے والے

یہ دن ہیں نئے اپنی خاصیتوں میں
کئی نام دل سے بھلا دینے والے

بتا دینا عمریں اسے کھوجنے میں
جو مل جائے اس کو گنوا دینے والے

پھر اپنے کیے پر پشیمان رہنا
یہ ہم ہی ہیں خود کو سزا دینے والے

منیرؔ اس زمانے میں رہبر بہت ہیں
حقیقت کو الجھن بنا دینے والے

غزل

سفر میں ہیں مسلسل ہم کہیں آباد بھی ہونگے
ہوئے ناشاد جو اتنے تو ہم دلشاد بھی ہونگے

زمانے کو برا کہتے نہیں ہم ہی زمانہ ہیں
کہ ہم جو صید لگتے ہیں ہمیں صیاد بھی ہونگے

بھلا بیٹھے ہیں وہ ہر بات اس گزرے زمانے کی
مگر قصے کچھ اس موسم کے ان کو یاد بھی ہونگے

ہر اک شے ضد سے قائم ہے جہان خواب ہستی ہیں
جہاں پر دشت ہے آثار ابر و باد بھی ہوں گے

منیر افکار تیرے جو یہاں برباد پھرتے ہیں
کسی آتے سمے کے شہر کی بنیاد بھی ہونگے

غزل

خلشِ ہجرِ دائمی نہ گئی
تیرے رُخ سے یہ بے رخی نہ گئی

پُوچھتے ہیں کہ کیا ہُوا دِل کو
حُسن والوں کی سادگی نہ گئی

سر سے سودا گیا محبت کا
دل سے پر اس کی بے کلی نہ گئی

اور سب کی حکایتیں کہہ دیں
بات اپنی کبھی کہی نہ گئی

ہم بھی گھر سے منیر تب نکلے
بات اپنوں کی جب سہی نہ گئی

غزل

ابر دھولے نئے نئے، شمس و قمر نئے نئے
اہلِ نظر نئے نئے، اہلِ خبر نئے نئے

لگتی ہیں کچھ عجیب سی بدلی ہوئی یہ بستیاں
ان کی خوشی نئی نئی، ہجر کے ڈر نئے نئے

رازِ بہشت کی کشش جن سے ہے باغِ ہست میں
پیدا ہوئے بہار میں ایسے شجر نئے نئے

سمتِ سیاہ جہل میں مدھم ہوئی سیاہیاں
چمکے ہیں اس کے وسط میں علم کے در نئے نئے

حیرت میں ہوں منیرؔ میں شہرِ خیال دیکھ کر
گلیوں میں گھر نئے نئے ان میں بشر نئے نئے

غزل

لمحہ لمحہ دم بہ دم
بس فنا ہونے کا غم

ہے خوشی بھی اس جگہ
اے مِری خُوئے اَلم

کیا وہاں ہے بھی کوئی
اے رہِ ملکِ عدم

رونقِ اصنام سے
ختم ہُوئے غم کے عَلَم

یہ حقیقت ہے مُنیر
خواب میں رہتے ہیں ہم

غزل

ہجرِ شب میں اک قرارِ غائبانہ چاہیے
غیب میں اک صورتِ ماہِ شبانہ چاہیے

سُن رہے ہیں جس کے چرچے شہر کی خلقت سے ہم
جا کے اک دن اُس حسیں کو دیکھ آنا چاہیے

اس طرح آغاز شاید اک حیاتِ نو کا ہو
پچھلی ساری زندگی کو بھول جانا چاہیے

وہ جہاں ہی دوسرا ہے وہ بُتِ دیر آشنا
اس جہاں میں اس سے ملنے کو زمانہ چاہیے

کھینچتی رہتی ہے دائم اس کو باہر کی ہوا
اس کو تو گھر سے نکلنے کا بہانہ چاہیے

بستیاں نامتفق ہیں میری باتوں سے مُنیر
ان میں مجھ کو ایک حرفِ محرمانہ چاہیے

غزل

ہے اُس گُل رنگ کا دیدار ہونا
کہ جیسے خواب سے بیدار ہونا

بتاتی ہے مہک دستِ حنا کی
کسی در کا پسِ دیوار ہونا

اسے رکھنا ہے صحراؤں میں حیراں
دلِ شاعر کا پُراسرار ہونا

کمالِ شوق کا حاصل یہی ہے
ہمارا شہر سے بیزار ہونا

مذاق آغاز ہے ان ساعتوں کا
ہے آخر جن کا وصلِ یار ہونا

یہی ہونا تھا آخر دشتِ غم کو
ہمارے ہاتھ سے گلزار ہونا

محبت کا سبب ہے بے نیازی
کشش اس کی ہے بس دشوار ہونا

منیرؔ اچھا نہیں لگتا یہ تیرا
کسی کے ہجر میں بیمار ہونا

غزل

دل عجب مشکل میں ہے اب اصل رستے کی طرف
یاد پیچھے کھینچتی ہے آس آگے کی طرف

چھوڑ کر نکلے تھے جس کو دشتِ غربت کی طرف
دیکھنا شام و سحر اب گھر کے سائے کی طرف

ہے ابھی آغاز دن کا اس دیارِ قید میں
ہے ابھی سے دھیان سارا شب کے پہرے کی طرف

صبح کی روشن کرن گھر کے دریچے پر پڑی
ایک رُخ چمکا ہوا میں اس کے شیشے کی طرف

دوریوں سے پُرکشش ہیں منزلیں دونوں منیرؔ
میں رواں ہوں خواب میں ناپید قصبے کی طرف

گیت گانا چاہتا ہوں حسنِ دلآرام کا
وصلِ گل کی صبح کا عہدِ وفا کی شام کا

میں نے جو دیکھے نہیں اُن منظروں کے درمیاں
ایک چہرہ ہے مثالِ نور زیرِ آسماں
منتظر جس کی ہے ہستی اُس رُخِ گلفام کا

اس کی آنکھوں کی چمک ہونٹوں کی رنگت میں کہیں
سحر ایسا ہے جو دنیا کی کسی شے میں نہیں
ہوش کی حد سے پرے کیفیتِ بے نام کا

گیت جو لاتا ہے کشتِ زندگی میں تازگی
جس کو سُن کر دور ہوتی ہے اداسی رات کی
جو مداوا ہے جہاں میں سختیٔ ایام کا

پنجابی شاعری کے تراجم

منظروں کی حمد

ہرے رنگ کی اونچی جھاڑی ہرے رنگ کا تھال ہے
اس پر جو اک پھول ہے اُن ہونٹوں جیسا لال ہے
کس درگاہ پہ چڑھے چڑھاوے رنگوں کی تجسیم کے
کون سے غیب پہ ٹوٹے یہ ظاہر زائر بہت قدیم کے

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

اُس کے وصال کا موسم

بجلی چمکی بادلوں اندر لال بہاروں جیسی
دیواروں، کوٹھوں، شجروں کے اُوپر
جھیلوں کھڑے پانیوں کے اوپر
بوندا باندی ہوتی رہی

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

ایک سایہ دیر تک

وہ تنگی اب پھر نہیں آئی ابھی یقین نہیں آتا
کھلی جگہ پہ آکر بھی وہ ڈر دِل سے نہیں جاتا

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

سبز دھرتی کی ہے یا ہے نیلے انبر کی ہوا
اس گھڑی آئی کہاں سے جلتے عنبر کی ہوا
گھر کے در کو بند رکھو دور تک میدان میں
خاک اڑاتی پھر رہی ہے پھر ستمبر کی ہوا

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

دھرتی ہی جب شور زدہ تھی
پیڑ ہرے کیوں ہوتے
سوچیں تھیں جب بہت پرانی
حرف نئے کیوں ہوتے

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

سمندر کی طرف ادھورا سفر

شکل سے وہ دریا لگتا تھا
اصل میں ایک سمندر تھا
تن تنہا میں کشتی میں تھا
دل میں وہم خدائی کے
سو سو ٹکڑوں کے سائے تھے
سو سو رنگ جدائی کے

ایک بار تو میں بھی ڈرا تھا
دریا کے زور روانی کا
آنکھوں کی آخری منزلوں تک تھا

خواب آب بہتے پانی کا

دفعتاً ہوا نظارا

سندریوں کے جنگل کا —

پانی کے اندر سے ابھرا

یا مجھوے جہانوں سے

ایک سماں کسی اور طرح کا

تنہا بہت زمانوں سے

دم لے کر سوتی اٹھا ہو جیسے

نیندوں کے استھانوں سے

مردہ شے جیسے زندہ ہو کر

نکلی بند مکانوں سے

اندر سُرخی باہر سبزی
سندریوں کے ستھروں کی
گُل پتوں کی حدوں کے پیچھے
چھپی تھی خالی نگروں کی

باد چلی تو جنگل جھوما
اُٹھی صدا اس راگوں کی
اس کے اندر چھپی تھی شوکر
ہرے رنگ کے ناگوں کی

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

غزل

بے خیال ہستی کو کام میں لگا دیا
ہجر کی اداسی نے شام کو سجا دیا

عشق کے شجر اس جا آنسوؤں سے اُگتے ہیں
حسن نے زمانے کو غم کا بن بنا دیا

بے یقین لوگوں میں بے یقین ہو جاتے
ہم کو خود پرستی نے شہر سے بچا دیا

دیر بعد آیا وہ اور اک زمانے میں
میں نے خواب مدت کا جاگ کر گنوا دیا

شاعری منیرؔ اپنی باغ ہے اجاڑ اندر
میں نے اک حقیقت کو وہم میں چھپا دیا

(اپنی پنجابی غزل کا ترجمہ)

غزل

ہے شکل تیری گلاب جیسی
نظر ہے تیری شراب جیسی

ہوا سحر کی ہے ان دنوں میں
بدلتے موسم کے خواب جیسی

صدا ہے اک دوریوں میں اوجھل
مری صدا کے جواب جیسی

وہ دن تھا دوزخ کی آگ جیسا
وہ رات گہرے عذاب جیسی

یہ شہر لگتا ہے دشت جیسا
چمک ہے اس کی سراب جیسی

منیرؔ تیری غزل عجب ہے
کسی سفر کی کتاب جیسی

(اپنی پنجابی غزل کا ترجمہ)

نئے رشتوں کی کھوج

کیا بن کر اب مِلوں میں اُس سے عاشق ، یار یا بھائی
شاعری میں مَیں ایسا ڈوبا بھُولا کل خُدائی
اب کیسے واپس آؤں اس فِکر نے عقل بھلائی
ایک طرف میں تنہا تن اور ادھر ہے کُل خدائی
دونوں میں انجان کھڑی ہے بیس برس کی جُدائی

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

پہلی بات ہی آخری تھی
منیر نیازی

خالد شریف

نذیر ہاشمی
غلام رسول اظہر
جون ۱۹۸۶ء

اِنتساب

مرحومہ

صُغرا خانم کے نام

مُنیر نیازی

وہ جو منکشف ہے جگہ جگہ

وہ جو سب سے آخری راز ہے

ایک بے رشتہ جہاں میں عالمِ خلقِ خدا
اور اُس کے درمیاں اعلانِ فکرِ رہ نما

ایک باطل وقت کے شام و سحر میں زندگی
ایک گُم گشتہ حقیقت کے نگر میں زندگی

جس میں ناموجود تھا میں وہ زمانہ دُور کا
جس میں ناآباد تھا میں وہ زمانہ دُور کا

وہ فضا اُس دَور کی اس میں جمالِ مصطفےٰ
جہل کی تاریکیوں میں شہر سا اِک نُور کا

اس زمانے میں مَیں اُس کا ذکر کرتا کس طرح
اُس زمانے کے سخن میں فکر کرتا کس طرح

بابِ روشن اس قدر تھا اُس جہانِ حُسن کا
رعبِ دل میں اس قدر تھا اس بیانِ حُسن کا

حوصلہ مُجھ میں نہ تھا تو بات کہتا کس طرح
یہ مرا منصب نہ تھا تو نعت کہتا کس طرح

اُس وقت میں اُس شہر میں موجود نہیں تھا

جس وقت اُڑی بلبل بادل کے گرجنے سے

تھرائیں ہری شاخیں بوندوں کے برسنے سے

میداں تھا بہت خالی موسم کے بدلنے سے

روشن تھا سرِ میداں اِک آگ کے جلنے سے

آواز ہُوئی غالب اس منظرِ دُنیا پر

اک علم نیا چمکا آثارِ زمانہ پر

جب پھر سے ملے دونوں دُوری کے مکانوں میں

اس وسعتِ ہستی کے مستور زمانوں میں

مَیں اور صغرا

ہم نے اکٹھے دُکھ سُکھ کاٹے راحت اور مجبُوری کے
وصل کی جھلمل جھلمل راتیں دن غُربت کی دُوری کے

اک ناواقف شہر کے اندر چُھپے ہُوئے شرمائے ہُوئے
دو جنگوں میں ساتھ رہے ہم ڈرے ہُوئے گھبرائے ہُوئے

بگڑے ہُوئے رشتوں کے جنگل . وحشت کے صحراؤں میں
ہم نے اکٹھے عمر بتا دی وقت کی دُھوپ اور چھاؤں میں

اپنے وطن کے لئے

زندگی اپنی وطن کی زندگی کا نام ہے
نام اس کا زندگی میں روشنی کا نام ہے

اپنے اہلِ فکر سے اس کی خبر ہم کو ملی
اِک نئی اُمید کی صبحِ سفر ہم کو ملی
یہ زمیں اسلام سے وابستگی کا نام ہے
زندگی اپنی وطن کی زندگی کا نام ہے
قائد اعظم نے اس کی راہ دکھلائی ہمیں
اس مقامِ شوق پر اس کی صدا لائی ہمیں
مُلکِ پاکستان شہرِ آگہی کا نام ہے
زندگی اپنی وطن کی زندگی کا نام ہے

اس ہدی خواں کی رفاقت میں عمل کے قافلے

چل رہے ہیں کل زمیں کے خوابِ راحت کے لیے

اپنا مقصد ساری دُنیا کی خوشی کا نام ہے

زندگی اپنی وطن کی زندگی کا نام ہے

شہرِ نامعلوم کی جادوگری کچھ کم ہوئی
اس سفر میں شوق کی دیوانگی کچھ کم ہوئی

حُسن جو دیکھا نہیں تھا اُس کو دیکھا سامنے
صُبح و شامِ زندگی میں اک کمی کچھ کم ہوئی

بے یقینی دل کی تھی کچھ پردہ داری کے سبب
صاف ملنے سے اُسے بیگانگی کچھ کم ہوئی

غم رُبا تھی سیرِ دُنیا ہجر کے آزار سے
اس طرح دِل میں جو تھی افسردگی کچھ کم ہوئی

حد بنانی تھی کہیں لا انتہا میں اے مُنیر
گھر بنا کر ذہن کی آشفتگی کچھ کم ہوئی

باغ میں جنگل سا اُگ آیا ہے

خود روئیدگی نے خاک کے اس ٹکڑے میں

دُھوم اُٹھا رکھی ہے

مَیں چاہتا ہُوں یہ پھر سے ایک ترتیب میں آ جائے

——— پھر سے باغ بن جائے

مگر وقت گزر جاتا ہے اور مَیں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا

"میرے بابا — میرے بابا —! تم کہاں جا رہے ہو؟

خدا کے لیے اتنا تیز نہ چلو

بات کرو، میرے بابا! اپنے ننھے بچّے سے کوئی بات کرو،

نہیں تو میں گُم ہو جاؤں گا —"

رات تاریک تھی، باپ وہاں نہیں تھا

بچّہ شبنم سے تھا بھیگ گیا

دلدل گہری تھی اور بچّہ رو دیا ہو کے مجبُور

اور پھر دُھند اُڑ گئی بہت دُور

چھوٹا سا اک گاؤں تھا جس میں
دئیے تھے کم اور بہت اندھیرا
بہت شجر تھے تھوڑے گھر تھے
جن کو تھا دُوری نے گھیرا
اتنی بڑی تنہائی تھی جس میں
جاگتا رہتا تھا دل میرا
بہت قدیم فراق تھا جس میں
ایک مقرر حد سے آگے

سوچ نہ سکتا تھا دل میرا

ایسی صورت میں پھر دل کو

دھیان آتا کس خواب میں تیرا

راز جو حد سے باہر میں تھا

اپنا آپ دکھاتا کیسے

سپنے کی بھی حد تھی آخر

سپنا آگے جاتا کیسے

تھی جس کی جستجو وہ حقیقت نہیں ملی
ان بستیوں میں ہم کو رفاقت نہیں ملی

ابتک ہیں اس گماں میں کہ ہم بھی ہیں دہر میں
اس وہم سے نجات کی صورت نہیں ملی

رہنا تھا اس کے ساتھ بہت دیر تک مگر
ان روز و شب میں مجھ کو یہ فرصت نہیں ملی

کہنا تھا جس کو اُس سے کسی وقت میں مجھے
اس بات کے کلام کی مہلت نہیں ملی

کچھ دن کے بعد اُس سے جُدا ہو گئے منیرؔ
اُس بے وفا سے اپنی طبیعت نہیں ملی

اتنی آساں زندگی کو اتنا مشکل کر لیا
جو اُٹھا سکتے نہ تھے وہ غم بھی شامل کر لیا

بارِ ہستی ہی بہت تھا بستیوں کی زیست میں
نیستی کے خوف کو بھی خواہشِ دل کر لیا

ہم تھے تنہا بے روایت ساعتوں کی قید میں
جس سبب سے ہم نے خود کو اتنا مہمل کر لیا

اُس دن

میری بات کے جواب میں
اُس نے بھی بات کی
اُس کے بات کرنے کے انداز میں
دیر کے گرے ہُوئے لوگوں ڈرا دیے گئے شہروں کا عجز تھا
جو پختہ ہو گیا تھا

اُس دن مَیں دیر تک اُداس رہا
کیا حُسن تھا کہ غرورِ حُسن بھُول گیا
اتنے برسوں میں اُس پر کیا بیتی
مَیں نے اُس سے نہیں پُوچھا

اِس شامِ نو بہار میں

اِس شامِ نو بہار میں آئے کہاں سے ہو
خوش خبریاں ہواؤں میں لائے کہاں سے ہو

پھیلی مہک سہاگ کی جامِ شراب سے
تازہ کِھلے گُلاب کی شہرِ خراب سے
خوشبُو مکانِ دُور کی لائے کہاں سے ہو

آئی صدا حبیب سی بزمِ جمال سے
پیدا ہُوئی مثال سی خوابِ خیال سے
آئندہ کے جواب کے دائم سوال سے
اتنے بڑے خمار کو لائے کہاں سے ہو

لفظوں اور نظموں کے اپنے موسم ہوتے ہیں

اک سپنے میں دو تین صدیاں،
کچھ ٹوٹی کچھ جڑی ہوئیں

اپنے اپنے وہم میں پکڑی
آس پاس ہیں کھڑی ہوئیں

ایک سرے پر فوجیں ہی فوجیں
بستیاں آگ میں جلی ہوئیں

ایک طرف آباد گھروں پر
راتیں تاروں جڑی ہوئیں

ایک طرف پر روشن راہیں
غیب کے اندر گئی ہوئیں

اک رستے پر بیریوں پیچھے

ناریں کوٹھوں چڑھی ہُوئیں

اور اِک صدی کے بچّے لے کر

اور اِک صدی میں کھڑی ہُوئیں

اُس کا نقشہ ایک بے ترتیب افسانے کا تھا
یہ تماشا تھا یا کوئی خواب دیوانے کا تھا

سارے کرداروں میں بے رشتہ تعلق تھا کوئی
ان کی بے ہوشی میں غم سا ہوش آ جانے کا تھا

عشق کیا ہم نے کیا آوارگی کے عہد میں
اِک جتن بے چینیوں سے دل کو بہلانے کا تھا

خواہشیں ہیں گھر سے باہر دُور جانے کی بہت
شوق لیکن دل میں واپس لَوٹ کر آنے کا تھا

لے گیا دل کو جو اس محفل کی شب میں اے مُنیرؔ
اُس حسیں کا بزم میں انداز شرمانے کا تھا

غم میں تمام رات کا جاگا ہُوا تھا مَیں
صُبحِ چمن میں چَین سے سویا ہُوا تھا مَیں

اِک ہفت رنگ ہار گرا تھا مرے قریب
اِک اجنبی سے شہر میں آیا ہُوا تھا مَیں

ترتیب مُجھ کو پھر سے نئی عمر سے دیا
اک عمر کے طلسم میں بکھرا ہُوا تھا مَیں

بے جان سا رہا تھا مَیں اطرافِ شام میں
ان راستوں سے پہلے بھی گزرا ہُوا تھا مَیں

مَیں ڈر گیا تھا دستکِ غم خوارِ یار سے
کُچھ حادثاتِ دہر سے سہما ہُوا تھا مَیں

خود کھو گیا مَیں خواہشِ بے نام میں مُنیرؔ
گھر سے کسی تلاش میں نکلا ہُوا تھا مَیں

رہِ شوق سیرِ مدام پر

رہِ شوق سیرِ مدام پر
کسی ایک خاص مقام پر
جو حیاتِ ذات کا حال ہے
اسے کہنا حرفِ محال ہے
بڑی دُور دُور کے سلسلے
ہیں اسی کے ساتھ جُڑے ہُوئے
کسی آگہی کے نشان سے
کسی زندگی کے گمان سے

بے خوابی کی ایک نظم

ایک جسم کو دوسرے جسم کے بنا
نیند نہیں آتی

وہ بے چین سا رہتا ہے
ساری بات ہے آنند کی

وہ آنند شراب کے گلاس میں ہے
یا کوئی دُعا ہے بچپن کی ، سونے سے پہلے کی
کوئی تاکید ہے ماں کی
یا کوئی آنکھ ہے جس میں التفات کی نظر تھی

سائے گھٹتے جاتے ہیں
جنگل کٹتے جاتے ہیں

کوئی سخت وظیفہ ہے
جو ہم رٹتے جاتے ہیں

سُورج کے آثار ہیں دیکھو
بادل چھٹتے جاتے ہیں

آس پاس کے سارے منظر
پیچھے ہٹتے جاتے ہیں

دیکھ منیرؔ بہار میں گلشن
رنگ سے اُڑتے جاتے ہیں

درخت بارش میں بھیگتے ہیں

کہ جیسے بھٹکے ہُوئے مسافر
درخت بن کر کھڑے ہُوئے ہیں
اک اور منظر میں جا بسیں گے
کچھ اس طرح سے رُکے ہُوئے ہیں
ذرا سی مہلت جو مل گئی ہے
خرابیاں ان میں آ گئی ہیں
جو فاصلے ان کے بیچ میں ہیں
اُداسیاں اُن میں اُگ رہی ہیں

کوئی فسانہ سا ہے یہ منظر

خراب و خوبِ جہانِ ثابت

فنا بقا سارے ساتھ مل کر

جسے بکھرنے سے روکتے ہیں

درخت بارش میں بھیگتے ہیں

غیر تماثتی نظارے

جن وقتوں میں بیلیں درختوں پر چڑھتی ہیں
جن وقتوں میں رُوحیں نئے علم پڑھتی ہیں

سارے جہاں کے اُوپر اِک رنگ چمکتا ہے
جس کے اثر سے ظاہر ہوتا ہے رُوپ آنکھ کا

فرقت کے موڑ پر کچھ یار مل رہے ہیں
جسموں کی حد کے اندر کچھ خواب کھل رہے ہیں

ہے یہی پہچان تیری اے جمالِ خوش ادا

رُوح کو بے چین کر دیتا ہے تیرا دیکھنا

کچھ گزشتہ اور آئندہ بہت ہی دُور سے

یاد آتے ہیں فسردہ اور کچھ مسرور سے

اس خلائے شہر میں صُورت نما ہوتا کوئی
اس نگر کے کاخ و کُو میں بُت کدہ ہوتا کوئی

منتشر افکار کی تجسیم تو ہوتی کہیں
سامنے اپنی نظر کے جسم سا ہوتا کوئی

یوں نہ مرکز کے لیے بے چین پھرتا مَیں کبھی
پیکرِ سنگیں سہی اپنا خُدا ہوتا کوئی

وہ جو مَیں نے کھو دیا ہے اس جہاں کے شوق میں
اُس جہانِ گمشدہ کا راستہ ہوتا کوئی

مَیں منیرؔ آزردگی میں اپنی یکتائی سے ہُوں
ایسے تنہا وقت میں ہمدم مرا ہوتا کوئی

تین عمریں گزرنے کے بعد بھی

یہ شجر جو شامِ خزاں میں ہیں
جو مکاں ہیں ان کے قریب کے
کسی عمر کی کوئی یاد ہیں
یہ نشان شہرِ حبیب کے
انھیں دیکھتا ہُوں مَیں چُپ کھڑا
جو گزر گئے اُنھیں سوچتا
یہ شجر جو شامِ خزاں میں ہیں
جو مکاں ہیں ان کے قریب کے
انھی بام و در میں مقیم تھے
وہ مکین شہرِ قدیم کے

ہم شک کے موسموں میں پیدا ہوئے

خموشی نے صدا ہونا نہیں ہے
درِ زنداں کو وا ہونا نہیں ہے

یہی سوچا مسلسل غم میں رہ کر
ہمیں غم سے رہا ہونا نہیں ہے

ہلا ہُوں یوں کسی گُل رُخ سے جیسے
کبھی اُس سے جُدا ہونا نہیں ہے

پرستش کر رہے ہیں اُن بُتوں کی
جنھیں اپنا خُدا ہونا نہیں ہے

مُنیرؔ اس خوب صورت زندگی کو
ہمیشہ ایک سا ہونا نہیں ہے

پہلی بات ہی آخری تھی

پہلی بات ہی آخری تھی
اس سے آگے بڑھی نہیں
ڈری ہوئی کوئی بیل تھی جیسے
پورے گھر پہ چڑھی نہیں
ڈر ہی کیا تھا کہہ دینے میں
کُھل کر بات جو دل میں تھی
آس پاس کوئی اور نہیں تھا
شام تھی نئی محبت کی

ایک جھجک سی ساتھ رہی کیوں
قرب کی ساعتِ حیراں میں
حد سے آگے بڑھنے کی
پھیل کے اس تک جانے کی
اُس کے گھر پر چڑھنے کی

یورشِ سختِ جبر میں خواہشِ جام سی کبھی
عیشِ دوام سی کبھی ان ہوئے کام سی کبھی

صبحِ بہار میں کبھی صحنِ خزاں میں بھی کبھی
بُجھتا ہُوا شرر کبھی رنگوں کی شام سی کبھی

اور کسی جہان میں ، حاضرِ جان سی کبھی!
غیبوں کے سحرِ دور میں ساعتِ عام سی کبھی

برقِ بہار ہے یا ہے کوئی سکوتِ غم فزا
رنگِ خموشِ در کبھی ، رونقِ بام سی کبھی

مثلِ خیالِ خامِ دل جیسے کہیں رُکی ہُوئی
ثابت ماہ وسال میں سیرِ مدام سی کبھی

ہے یہ مُتَیّر شاعری میری فضائے زندگی
شاملِ حال سی کبھی ماضی کے دام سی کبھی

محبت اب نہیں ہو گی

ستارے جو دمکتے ہیں
کسی کی چشمِ حیراں میں
ملاقاتیں جو ہوتی ہیں
جمالِ ابر و باراں میں
یہ ناآباد وقتوں میں
دلِ ناشاد میں ہو گی
محبت اب نہیں ہو گی
یہ کچھ دن بعد میں ہو گی
گزر جائیں گے جب یہ دن
یہ ان کی یاد میں ہو گی

خوشی بھی کوئی غم لگتی تھی
ایسے اس پر چھائے تھے

چنتا کیسی ہے من میرے

بپتا جیسی ہو کچھ جیسے

برہا جیسی ہو کچھ جیسے

یادیں جیسے ہوں کچھ ٹوٹی

کونپل کوئی جو پھر پھوٹی

کوئل کوئی جو پھر کوکی

عمریں جیسے واپس آئیں

رشتے جیسے گم ہو جائیں

مدھم جیسے غم ہو جائیں
برکھا جیسی ہو کچھ جیسے
پُروا جیسی ہو کچھ جیسے
چنتا کیسی ہے ——

ہے اُس کے گرد یہ محفل جو اِک سوال میں چُپ
لگی ہے اُس کو بھی ایسے کسی خیال میں چُپ

ہے ایک طرفہ تماشہ طبیعتِ عشّاق!
کبھی فراق میں باتیں کبھی وصال میں چُپ

خبر ہے اُس کو بہت وقت کے گزرنے کی
ہے حُسن اپنے ہی اندوہِ لازوال میں چُپ

نگہ میں حُسنِ بیاں جن کے بولنے سے تھا
ہُوئے وہ اہلِ ہُنر رنجشِ زوال میں چُپ

بہت کلام گزشتہ میں کر چکے ہیں مُنیرؔ
دکھائی دیتے ہیں ہم جو بیانِ حال میں چُپ

میرا اشانت ہونا

دو خوبصورت عورتیں غرّا رہی ہیں

بجلیوں کی چمک میں

وقفے وقفے سے بوچھاڑ کی طرح آتی ہوائیں

دو خوبصورت عورتیں

دل کی وحشت میں غرّا رہی ہیں

یہ اشانت عورتیں مجھے اشانت کرتی ہیں

یہ نہیں کہ موسم کا مُجھ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا

پر میرے دِل میں فکر اتنا ہے

کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلتا میرے آس پاس کیا ہو رہا ہے
کتنا وقت گزر گیا ___ اور کیسے گزر گیا
بس کبھی کبھی موسم کی وجہ سے
کبھی کبھی عورتوں کی وجہ سے اشانت سا ہو جاتا ہوں

خوبصورت عورتیں

کھڑکیوں جھروکوں کی
گُل ہَوا کے جھونکوں میں
بن سنور کے بیٹھی ہیں
مختلف زمانوں میں
تن بدلنے جاتی ہیں
تن بدل کے آتی ہیں
اَور بیٹھ جاتی ہیں
کھڑکیوں جھروکوں کے

دلنواز دھوکوں میں
دلکشی کی یہ فرقت
اِک عجیب جنّت ہے
خواب ہے حقیقت کا
مشکلوں میں فرصت ہے

اس طرح کی جنّت میں
سانپ تک نہیں آتا
اس سکونِ خوش دل میں
اس خموشِ راحت میں
مور تک نہیں گاتا

کوئی اور طرح کی بات کرو

کوئی اور طرح کی بات کرو ـــــ!
دل جس سے سب کا بہل جائے
دھیان اور طرف کو نکل جائے
کوئی اور طرح کی بات کرو ـــــ!
دھیان اور طرف کو نکل جائے
کسی اور خیال میں ڈھل جائے
بے مصرف دن کے آخر پہ
یہ ڈھلتی شام سنبھل جائے
اس سخت مقام زمانے کا
یہ سخت مقام بدل جائے
کوئی اور طرح کی بات کرو

کسی گھاٹ پہ کشتی آن لگے
کوئی نئی نئی پہچان لگے
کوئی نیا نیا انجان لگے
بے مصرف دن کے آخر پر
یہ ڈھلتی شام سنبھل جائے
کوئی اور طرح کی بات کرو

لمحہ لمحہ دم بہ دم
بس فنا ہونے کا غم

ہے خوشی بھی اس جگہ
اے مری خُوئے الم

کیا وہاں بھی ہے کوئی
اے رہِ مُلکِ عدم

رونقِ اصنام سے
خم ہُوئے غم کے عَلَم

یہ حقیقت ہے مُنیرؔ
خواب میں رہتے ہیں ہم

گہری گہری تکتی آنکھیں
راز چُھپا کر رکھتی آنکھیں

صاف آئینے میں بھی جیسے
خود کو دیکھ نہ سکتی آنکھیں

کُل عالم میں دیکھیں مَیں نے
دیکھ دیکھ کر تھکتی آنکھیں

پل دو پل کو ظاہر ہو کر
پردوں میں جا بستی آنکھیں

بادل، باغ، بہار، مُنیرؔ
دیواروں پر ہنستی آنکھیں

ہونی کے حیلے

کس کا دوش تھا کس کا نہیں تھا
یہ باتیں نہیں اب کرنے کی
وقت گزر گئے توبہ والے
راتیں نہیں آہیں بھرنے کی
جو بھی ہُوا وہ ہونا ہی تھا
ہونی روکے رُکتی نہیں
ایک بار جب شروع ہو جائے
بات پھر ایسے رُکتی نہیں

کچھ یوں بھی راہیں مشکل تھیں
کچھ گلے میں غم کا طوق بھی تھا
کچھ شہر کے لوگ بھی ظالم تھے
کچھ مجھے مرنے کا شوق بھی تھا

(اپنی پنجابی نظم کا ترجمہ)

کیسی جگہ پر چل کر بیٹھیں

کِس ایوان میں مِل کر بیٹھیں
کِس مرکز کِس رَستے پر
کِس افسوس کے مسکن جاں میں
کِس شادی کے چشمے پر
دل کی بات جہاں ہم بانٹیں
ان وقتوں میں رہنے کی
دل لگ جائے جن شہروں میں
اُن شہروں میں رہنے کی

ہماری ساری عمر

اپنی کم علمی اور نادانی کو

چھپانے میں گزر جاتی ہے

پھر صبح کی ہوا میں جی میں ملال آئے
جس سے جُدا ہُوئے تھے اُس کے خیال آئے

اس عمر میں غضب تھا اُس گھر کا یاد رہنا
جس عمر میں گھروں سے ہجرت کے سال آئے

اچھی مثال بنتیں ظاہر اگر وہ ہوتیں
اُن نیکیوں کو ہم تو دریا میں ڈال آئے

جن کا جواب شاید منزل پہ بھی نہیں تھا
رستے میں اپنے دل میں ایسے سوال آئے

کل بھی تھا آج جیسا ورنہ مُنیرؔ ہم بھی
وہ کام آج کرتے کل پر جو ٹال آئے

جفائیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں
وفائیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں

بہاریں دیر تک رہتی ہیں کم آباد قریوں میں
خزائیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں

صدا ہنسنے کی ہو افسوس کی یا آہ بھرنے کی
صدائیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں

اندھیرا جب گھنا ہو تو چراغِ راہِ ویراں کی
شعاعیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں

مُنیرؔ آباد شہروں کے مکینوں کی ہوا لے کر
ہوائیں دُور تک جاتی ہیں کم آباد شہروں میں

کشش اور ردِ کشش

سارے عالم میں مراکز ہیں خوشی کے
عورتوں کے باغ کے
ایک پل کی اور کافی دیر تک کی دوستی کی
صورتوں کے باغ کے
ہیں خیاباں در خیاباں رشتہ ہائے زندگی
مستقل اور عارضی
سب گزر گاہوں سے ہو کر
ہم کو جانا ہے کہاں
سب خیابانوں میں پھر کر
ہم کو آنا ہے کہاں

اُس کا میرا رشتہ کیا ہے

قُرب کا معمولی رشتہ ہے کچُھ دن ساتھ گزارنے کا

سب کچُھ ان بیتے جیسا ہے

وقت کا اک ٹکڑا سا جیسے

گھاٹ پہ اک لمحہ سا جیسے دریا پار اُتارنے کا

خیال جس کا تھا مجھے خیال میں ملا مجھے
سوال کا جواب بھی سوال میں ملا مجھے

گیا تو اس طرح گیا کہ مدتوں نہیں ملا
ملا جو پھر تو یوں کہ وہ ملال میں ملا مجھے

تمام علم زیست کا گزشتگاں سے ہی ہوا
عمل گزشتہ دور کا مثال میں ملا مجھے

ہر ایک سخت وقت کے بعد اور وقت ہے
نشاں کمالِ فکر کا زوال میں ملا مجھے

نہالِ سبز رنگ میں جمال جس کا ہے مُنیرؔ
کسی قدیم خواب کے محال میں ملا مجھے

اُداسی کو بیاں کیسے کروں مَیں
خموشی کو زباں کیسے کروں مَیں

بدلنا چاہتا ہُوں اس زمیں کو
یہ کارِ آسماں کیسے کروں مَیں

بھروسہ ہی نہیں مجُھ کو کسی پر
کسی کو رازداں کیسے کروں مَیں

شبِ دیجور ہے اور سوچتا ہُوں
فلک کو کہکشاں کیسے کروں مَیں

کسی جنگل کا طائر ہُوں مَیں اے دل
گلوں میں آشیاں کیسے کروں مَیں

مُنیرؔ اس عہدِ آشفتہ سری میں
خیالِ جسم و جاں کیسے کروں مَیں

گھرا ہے یوں ہجوم میں

کہ جیسے ماہ شام کا

نئے نئے نجوم میں

چمک جو ہر نظر میں ہے

وہ اس سے بے خبر نہیں

جو بات سب کے دل میں ہے

وہ اس سے بے خبر نہیں

ذرا ذرا سی بات کا
تمام علم اس کو ہے
ہر ایک دن کی رات کا
حیاتِ خوش خرام میں
کوئی نیا مکان ہے
نئے قمر کی شام میں

یہاں ہے ہر ایک شے کی ہستی
نہیں کی ہستی میں ہے کی ہستی

حرام ہے جن میں مے پرستی
ہے اُن دنوں میں ہی مے کی ہستی

خزاں کا بے برگ و ساز ہونا
اسی سے ہے برگِ نے کی ہستی

دَم پریشاں سے ہو گئی ہے
وجود میں ہے جو لے کی ہستی

مُنیرؔ ہم کو ملی ہے کیسی
مصیبتِ پے بہ پے کی ہستی

سیاہی شب کی مدّھم ہو گئی ہے
یہ شب کچھ اور مبہم ہو گئی ہے

لیے جاتی ہے سارے خواب میرے
یہ رُت ہجرت کا عالم ہو گئی ہے

اُداسی اِس میں ہے صبحِ ازل کی
ہوا کیسی سحر دَم ہو گئی ہے

کہ جیسے جانتی ہے راز سارا
حیاتِ انکارِ پیہم ہو گئی ہے

منیرؔ انجامِ رنج رائیگاں ہے
اذیت ہجر کی کم ہو گئی ہے

یہ بے قاعدہ سے دِن

وہ نظریں جو راہ دکھاتی ہیں

دُھندلی ہے

وہ باتیں جو راہ دکھاتی ہیں

دُھندلی ہے

وہ شامیں جو راہ میں آتی ہیں

دُھندلی ہیں

وہ صُبحیں جو راہ میں آتی ہیں

دُھندلی ہیں

جو شکلیں بیچ میں آتی ہیں
دُھندلی ہیں
جو سوچیں بیچ میں آتی ہیں
دُھندلی ہیں

اُس سمت مجھ کو یار نے جانے نہیں دیا
اِک اور شہرِ یار میں آنے نہیں دیا

کچھ وقت چاہتے تھے کہ سوچیں ترے لیے
تُو نے وہ وقت ہم کو زمانے نہیں دیا

منزل ہے اس مہک کی کہاں کس چمن میں ہے
اس کا پتہ سفر میں ہوا نے نہیں دیا

روکا انا نے کاوشِ بے سُود سے مجھے
اُس بُت کو اپنا حال سُنانے نہیں دیا

ہے جس کے بعد عہدِ زوال آشنا مُنیرؔ
اتنا کمال ہم کو خُدا نے نہیں دیا

غم سے لپٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں
دُنیا سے کٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں

دن رات بانٹتے ہیں ہمیں مختلف خیال
یوں ان میں بٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں

اتنے سوال دل میں ہیں اور وہ خموش در
اُس در سے ہٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں

ہیں سختئ سفر سے بہت تنگ پر منیرؔ!
گھر کو پلٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں

یہاں سے جا چُکا ہے جو اُسے کم یاد کرنا ہے
کہ بے آباد گھر کو پھر مجھے آباد کرنا ہے

کُلیات میں شامل شعری مجمُوعے

ہم ہیں مثالِ ابر مگر اس ہوا سے ہم
ڈر کر سمٹ ہی جائیں گے ایسے بھی ہم نہیں

منیر نیازی

۲۹ جون ۱۹۸۶
[illegible]